

راہ تکتا ہے شہرِ جاناں

”سنو! تم نے میرے پاپا کو دیکھا ہے ناں!“

سنیہ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر کے پوچھا تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے میری نظروں میں اس کے پاپا کا وجیہہ سراپا آن سما یا۔ اور میرا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے کسی اجنبی اور خوبصورت چیز کے بارے میں پوچھا جائے تو اپنے آپ آنکھوں میں ہلکی سی چمک اور ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ آن ٹھہرتی ہے۔

پھر میں نے سنیہ کو دیکھا تو وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو اسے ٹوک کر پوچھا۔

”ہاں! کیا ہوا تمہارے پاپا کو.....؟“ جواب میں اس نے گہری سانس کھینچی۔ پھر پوچھنے لگی۔

”تم نے دیکھا ہے ناں انہیں!“

”ہاں بھئی دیکھا ہے دو تین بار، تم نے ہی تو ملوایا تھا۔ پہلی بار جب میں تمہارے گھر آئی۔“

راہ تکتا ہے شہرِ جاناں

نگہت عبدُ اللہ

کہا۔

”ہا..... ہا..... مجھے کہاں لفٹ کرائیں گے وہ.....!“

اور وہ سمجھ گئی کہ میں اس کی بات کو مذاق سمجھ رہی ہوں یا مذاق میں اڑا رہی ہوں۔ جیسی

فورا بولی۔

”سنو! میں مذاق نہیں کر رہی۔“

میں نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا پھر نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی صرف اس لئے کہ کہیں میرے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو اس کے پاپا کے بارے میں ہو سکتی تھی اور یقیناً اسے بری لگتی۔ جبکہ وہ میرے لئے ناممکن تھا لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ اس کی ہر جائز ناجائز بات پر لبیک کہہ دوں۔

”ٹوہیہ.....!“

اس نے میرا بازو چھو کر دھیرے سے پکارا تو بہت سنبھل کر میں نے اسے دیکھا۔ میری رانگی کے خیال سے وہ بہت خائف سی بیٹھی تھی۔

”تمہیں میری بات بری لگی تو میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔“

اس نے کہا تو میں نے قصداً مسکرا کر اس کا ہاتھ دبایا پھر قدرے توقف سے بلکہ ہچکے ز میں پوچھا۔

”تو تمہارے پاپا شادی کرنا چاہتے ہیں.....“

”میں نے زبردستی انہیں آمادہ کیا ہے، وہ تو مان ہی نہیں رہے تھے۔“

اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

”پھر.....؟ میرا مطلب ہے تم کیوں زبردستی کر رہی ہو۔“

”اس لئے کہ میرے بعد وہ بالکل اکیلے ہو جائیں گے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا، اگلے

م آ رہا ہے اور اس کافی الحال یہاں سیٹ ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔ یعنی شادی کر کے وہ مجھے

”ہاں بھئی دیکھا ہے دو تین بار، تم نے ہی تو ملوایا تھا۔ پہلی بار جب میں تمہارے گھر آئی

تھی تو.....“

”کیسے لگے تمہیں؟“

میری بات ابھی جاری تھی کہ اس نے سوال کر دیا۔

”بہت اچھے۔ جینس اتنے ہینڈم، اسمارٹ..... مجھے ایسے لوگ بہت اچھے لگتے

ہیں۔“

میں نے اس کے پاپا کی تعریف میں کہیں بخل سے کام نہیں لیا۔ بے ساختہ اور برملا اظہار کرتے ہوئے میں ذرا نہیں جھجکی اس لئے کہ وہ میری دوست تھی اور اپنے باپ کے بارے میں پوچھ رہی تھی جو حقیقتاً ایسے ہی بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تھے، معاً کسی خیال کے تحت میں نے چونک کر پوچھا۔

”خیریت، تمہارے پاپا کے بارے میں کسی نے غلط سلط کہا ہے کیا؟“

”نہیں.....“

”پھر تم مجھ سے.....؟“

میری سمجھ میں نہیں آیا کیا کہوں اور وہ مسکرا کر بولی۔

”میں تمہاری رائے جاننا چاہتی تھی“

”کیوں.....؟“ وہ میرا کیوں نظر انداز کر کے بڑے آرام سے پوچھنے لگی۔

”شادی کرو گی ان سے.....؟“

”کیا!!!“

میں سچ مچ اچھل پڑی۔ پھر خیال آیا شاید مذاق کر رہی ہے کیونکہ اس کے پاپا سے ملنے کے بعد میں خود کئی بار اس سے مذاق میں کہہ چکی تھی کہ انہیں ابھی بھی بہت اچھی لڑکی مل سکتی ہے۔ ورنہ بالبدلہ لینے کے لئے وہ مجھ سے کہہ رہی ہے۔ بس اسی خیال کے تحت میں نے مصنوعی آہ بھر کر

کینیڈا لے جائے گا۔“

وہ سب بتاتی ہوئی کہنے لگی۔

”اور مجھے وہاں ہر دم پاپا کی تنہائی کا خیال پریشان کرے گا، اس لئے میں چاہتی ہوں

وہ شادی کر لیں، کیا میں نے غلط سوچا ہے؟“

”نہیں بالکل ٹھیک سوچا ہے تم نے.....“ میں نے ایمانداری اور غیر جانبداری سے کہا۔

”ان کی شادی ہونا کوئی مشکل بات نہیں ہے لیکن تمہیں میرا خیال کیوں آیا.....؟“

”میں تم سے جھوٹ نہیں کہوں گی ثوبیہ۔ یقین کرو جب میں نے پاپا کو شادی کے لئے

آمادہ کیا اس وقت تک مجھے تمہارا خیال نہیں تھا۔ وہ تو جب میں یہ سوچنے بیٹھی کہ تمہارے ساتھ مل

کر پاپا کے لئے کوئی خاتون تلاش کروں تو میرا ذہن آپ ہی آپ تم میں الجھ کر رہ گیا، شاید اس لئے

کہ میں تمہاری پسند ناپسند سے واقف ہوں اور تم اپنے آئیڈیل میں جو خوبیاں بتاتی ہو عمر سے قطع

نظر کیا میرے پاپا میں وہ سب خوبیاں نہیں ہیں۔ ویسے عمر بھی آئیڈیل ہے فورٹی فائیو..... تم ایسے

ہی لوگوں سے متاثر ہوتی ہو۔“

اس کا انداز مجھے قائل کرنے والا نہیں تھا بلکہ وہ بہت سیدھے سادے انداز میں بتا رہی

تھی، وہ باتیں جو میں اکثر اس سے کہتی تھی۔ اب وہ کہہ رہی تھی تو میں گم سم بیٹھی تھی۔ وہ خاموش ہو

کر کچھ دیر تک میری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

”میرے خلوص اور میری دوستی پر شبہ نہیں کرنا ثوبیہ۔ میں نے جو سوچا کہہ دیا۔ اور اب تم

کچھ بھی کہنے سے پہلے سوچ ضرور لو۔ میرا مطلب ہے سوچنے کے بعد تم جو گالیاں مجھے دو گی وہ ان

گالیوں سے نسبتاً ہلکی ہوں گی جو ابھی تمہارے ہونٹوں سے نکلنے کو بے قرار ہیں۔“

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔

”تم الوکی.....“

”بس باقی بعد میں.....“

وہ کہتی ہوئی سی ویو کی سیڑھیاں پھلانگ کر لہروں کے تعاقب میں دور تک چلی گئی پھر

وہیں سے اشارے سے مجھے بلانے لگی لیکن میں نے منع کر دیا۔ حالانکہ میں اس سے زیادہ دیوانی

تھی۔ پانی کو دیکھ کر تو مجھے اپنے آپ پر اختیار ہی نہیں رہتا تھا۔ اور اب اس کے بار بار بلانے پر بھی

میں نہیں گئی بالآخر وہ خود ہی چلی آئی اور آتے ہی بگڑنے لگی۔

”بہت بدتمیز ہو تم، آئیں کیوں نہیں۔“

”دیر ہو جانے کے خیال سے۔ تمہیں پتہ ہے پانی میں جا کر میرا واپس آنے کو دل نہیں

چاہتا۔ چلو اب میں تمہیں آنسکریم کھلاؤں۔“

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی لے آئی۔ پھر آنسکریم لے کر گاڑی تک آنے سے پہلے

ہی ہم نے کھانی شروع کر دی۔

”اگر پاپا دیکھ لیں ناں تو بہت ڈانٹیں گے۔“

اس نے کہا تو میں نے یونہی پوچھ لیا۔

”کیوں، کیا وہ آنسکریم کھانے سے منع کرتے ہیں؟“

”راتے میں کھانے سے۔“

”جبکہ راتے میں کھانے میں ہی مزہ آتا ہے۔“

میں نے کپ خالی کر کے ایک طرف پھینکتے ہوئے کہا تو اس نے فوراً میری تائید کی۔

پھر ادھر ادھر دیکھتی ہوئی بولی۔

”یہ ہماری گاڑی کہاں چلی گئی!“

”میرا خیال ہے ہم گاڑی پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔“

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ واقعی ہم باتوں میں آگے نکل آئے تھے۔ ایک دوسرے کو الزام

دیتے ہوئے ہم واپس پلٹ کر آئے، پھر گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے حسب عادت پہلے کیسٹ آن

کیا۔ اس کے بعد گاڑی اشارت کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

روم کی طرف دھکیل دیا۔

میری تیاری میں صرف پانچ منٹ لگے۔ اس کے بعد میں کمرے سے نکل کر آئی تو بھابھی بھی لوازمات سے سچی ٹرائی لئے برآمدے ہی میں کھڑی تھیں۔

”میں یہ لے کر نہیں جاؤں گی۔“

میں نے ٹرائی لے جانے سے صاف منع کر دیا۔ کیونکہ یہ پرانا طریقہ مجھے بہت عجیب سا لگتا تھا۔ اور بھابھی اس وقت غالباً بحث سے بچنے کی خاطر ٹرائی دھکیلتی ہوئی آگے آگے چل پڑیں ان کے پیچھے میں کمرے میں داخل ہوئی تو اچھی خاصی بولڈ ہونے کے باوجود گھبرا گئی اور اسی گھبراہٹ میں قریب جو خالی جگہ نظر آئی، فوراً بیٹھ گئی۔ بھابھی نے مجھے چونک کر دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں جانے کیا اشارہ کیا۔ میں بالکل نہیں سمجھی اور انہیں بھی نہ سمجھنے کا اشارہ کر رہی تھی کہ قریب سے کہا گیا۔

”وہ غالباً آپ کو میرے پاس بیٹھنے سے منع کر رہی ہیں۔“

”ہائیں!“ میں اچھل پڑی اور پھر پوری گردن گھما کر اسے دیکھا تو شوخی سے بولا۔

”پوچھ لیں، وہ یہی کہہ رہی ہیں۔“

”ان سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں واقعی غلط جگہ آ کر بیٹھ گئی ہوں۔“

میں کبھی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور جانا چاہتی تھی کہ امی نے بلا کر اپنے پاس بٹھالیا اور خواتین سے میرا تعارف کروانے لگیں۔ وہی رٹے رٹائے جملے تھے۔

”یہ میری بیٹی ثوبیہ ہے۔ ابھی گریجویٹیشن کیا ہے، ماشاء اللہ بہت ذہن ہے وغیرہ

وغیرہ۔“

میری نظریں بلا ارادہ ہی اس کی طرف اٹھیں تو وہ یوں دیکھ رہا تھا جیسے جتا رہا ہو کہ تمہاری امی تمہاری کتنی تعریفیں کریں، ہوگا وہی جو میں چاہوں گا۔

”ہونہہ۔۔۔۔۔“ میں نے سگ کر سر جھٹکا اور شاید بھابھی نے دیکھ لیا اور نکتے وہاں سے

”میرے گھر چلو گی یا۔۔۔۔۔“

”نہیں پہلے مجھے ڈراپ کر دو۔“ میں نے فوراً کہا تو وہ گھڑی پر نظر ڈالتی ہوئی بولی۔

”کوئی اتنی دیر تو نہیں ہوئی۔“

اور اچانک مجھے یاد آیا امی نے جلدی آنے کو کہا تھا۔ وجہ بھی بتائی تھی انہوں نے، جیسی

میں پریشان ہو گئی۔

”گاڑی تیز چلاؤ سنیو ورنہ آج میری خیر نہیں۔“

”اچانک کیا یاد آ گیا تمہیں۔۔۔؟“

میری پریشانی پر اس نے تعجب سے پوچھا۔ تو جانے کیوں میں اسے اصل بات نہیں بتا

سکی۔ بلکہ گول مول سا جواب دے کر مال دیا۔ اور جب اس نے مجھے گھر کے سامنے اتارا تب بھی

میں نے ہمیشہ کی طرح اس سے اندر آنے پر بہت زیادہ اصرار نہیں کیا۔ بس سرسری انداز میں ایک

بار کہا اور اس کے منع کرنے پر جلدی سے اتر کر اندر آئی۔

”میں نے تم سے کہا بھی تھا کہ جلدی آنا۔ جاؤ اپنا حلیہ ٹھیک کرو!“

امی نے مجھے دیکھتے ہی ٹوک کر کہا تو میں جلدی سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ الماری

کھول کر کپڑے نکال رہی تھی کہ بھابھی میرے پاس آ کر کہنے لگیں۔

”سنو، اب نہانے میں مت لگ جانا۔ جلدی سے چنچ کر کے آ جاؤ۔ مہمان کئی بار تمہارا

پوچھ چکے ہیں۔“

”کون کون ہیں۔۔۔؟“ میں کسی طرح اپنا اشتیاق چھپا نہیں سکی تو بھابھی بھی ہنس کر

بولیں۔

”وہ بھی ہے۔“

”کیسا ہے۔۔۔؟“

”مجھے تو اچھا لگا، تمہیں پتہ نہیں کیسا لگے، جاؤ اب جلدی کرو۔“ بھابھی نے مجھے دھاک

اور باوقار۔ میں بھول گئی یا شاید اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں کہ سنجیدگی اور بردباری ایک خاص عمر کے بعد شروع ہوتی ہے۔ جب وقت ذمہ داریاں ڈالتا ہے تو اچھا خاصا چنچل انسان اپنے آپ سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اور ابتدا میں ایسا ہی سوچتی تھی۔

میری شونیوں پر اچنتی نظر ڈال کر اپنے آپ محفوظ ہو جانا۔
میری شرارتوں پر پیار بھری سرزنش۔

وہ کبھی اظہار نہ کرے تب بھی اس کے وجود سے صرف محبت کا احساس ملے۔
سب سے پہلے جس شخص میں مجھے اپنے آنیڈیل کی جھلک نظر آئی وہ میرے تھلے چچا تھے یا شاید ہو سکتا ہے ان سے متاثر ہو کر میں نے آنیڈیل بنایا ہو۔ میرا خیال ہے دوسری بات ٹھیک ہے۔ اس وقت میں لڑکپن کی عمر میں تھی۔

تھلے چچا کا گھر ہمارے گھر سے بس آدھے فرلانگ کے فاصلے پر تھا اور شاید کاروبار میں شراکت کے باعث ہی ان کا ہمارے ہاں زیادہ آنا جانا تھا۔ دفتری اوقات کے علاوہ اکثر کام ہی کے سلسلے میں وہ رات میں ابو کے پاس آ جاتے تھے۔ پر سالی تو ان کی تھی ہی غضب کی اس پر لہجے میں شفقت کے ساتھ گہری وابستگی کا تاثر ملتا تھا اور جانے کیسے مقابل کو اپنی ذات کا مان دے جاتے تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے اس دنیا میں ایک بس وہی ہیں۔

ان کے بعد ہمارے اسکول کے پرنسپل، ان کی شخصیت بھی ایسی ہی سحر انگیز تھی۔ ان دنوں میں اور سنیع شرارتوں میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ عاجز آ کر کئی بار ٹیچر نے پرنسپل سے شکایت کی اور ہر بار ہمیں بلا کر وہ پہلے خوبصورت انداز میں ہمیں سراہتے۔

”گڈ! مجھے شرارتی بچے اچھے لگتے ہیں کیونکہ وہ ذہین بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ایسی شرارت جو کسی کو نقصان پہنچائے، بد تمیزی کی حد میں داخل ہو جاتی ہے۔“

پھر وہ ہماری شرارتوں کے لئے ایک حد مقرر کر دیتے۔ منع کبھی نہیں کیا۔ ایسے میں مبہم سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کے اندر محسوس ہوتی تھی۔ اور مجھے ایسے ہی لوگ اچھے لگتے تھے جن کا

اٹھا کر باہر لے آئیں اور میرے کمرے کی طرف دھکیلتی ہوئی بولیں۔
”کوئی حماقت نہیں کرنا!“

”مثلاً کس قسم کی؟“ میں نے رک کر پوچھا۔
”کسی بھی قسم کی۔“ وہ کہتی ہوئی وہیں سے پلٹ گئیں۔

پھر مہمانوں کے جانے کے بعد امی مسلسل ان کی تعریف کرتی رہیں۔ غالباً انہیں لڑکا بھی پسند آیا تھا۔ اور جب تک مجھ سے رائے نہ لی جاتی میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ اس لئے خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ میری موجودگی میں بھابھی سے کہہ رہی تھیں، مقصد مجھے سنانا تھا۔

”لڑکا پڑھا لکھا ہے اور کے ڈی اے میں انجینئر ہے۔ زیادہ بڑا کنبہ بھی نہیں ہے۔ اب اور کیا چاہئے۔“ آخری جملہ تو انھوں نے باقاعدہ مجھے دیکھ کر کہا تھا۔

”اور کیا چاہئے مجھے۔“ رات تکیے پر سر رکھتے ہی میں نے سوچا تو ایک جھماکے سے میرے ذہن کے پردے روشنی میں نہا گئے۔

مجھے نہیں یاد، میں نے کب ایک خیالی پیکر تراش لیا تھا۔ شاید اس وقت جب بچپن کی بے ساختگیوں اور بے اختیار یوں پر کوئی ان دیکھے ہاتھ اچانک بند باندھ دیتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چلا، کب، کیسے، کیوں ہوا کہ بے تحاشا نہتے ہوئے اپنے اندر سے ہی کسی نے ٹوک دیا اور پھر قدم قدم پر احساس کہ کوئی ساتھ ہے، بڑا لطیف سا احساس تھا۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ میری سوچ کے مطابق ایک سانچے میں ڈھلتا گیا۔

میں نے کبھی اسے زندہ انسانوں میں ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ میں جتنی خوابوں کی دنیا میں رہتی تھی اس سے کہیں زیادہ حقیقت پسند تھی البتہ کبھی اس سے ملتا جلتا شخص سراو یا کسی موٹر پر سامنے آ جاتا تو میں چونک کر دیکھتی تھی۔

اور کتنی عجیب بات تھی کہ میرے تخیل میں سامنے والا میرے مزاج کے بالکل برعکس تھا۔
میں میں اچھی خاصی رنگین مزاج شوخ اور کسی حد تک شرارتی تھی اور وہ اتنا درجے کا سنجیدہ، بردبار

اعصاب پر سکون ہونے لگے تھے۔ بند پگلوں کے اندر جو چہرہ سامنے آیا اس نے مجھے پھر سے الجھا دیا۔

”نہیں نہیں وہ میری دوست کے پاپا ہیں۔ اس حساب سے.....“
میں نے ان کے اور اپنے درمیان کوئی معتبر سارشتہ قائم کرنا چاہا لیکن کوئی رشتہ نہیں بن پایا۔

”واٹ آگریٹ پر سنالٹی.....!“

پہلی بار ان سے مل کر میں نے پر جوش انداز میں سنیعہ سے کہا تھا۔

”یہ اتنے بنیڈ سم تمہارے پاپا ہیں..... بالکل نہیں لگتے۔“

”کیوں کیوں کس حساب سے نہیں لگتے۔“ سنیعہ پتہ نہیں کیا سمجھ کر چلائی تھی۔

”کسی حساب سے نہیں۔“

اس کے چلانے کا میں نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور جہاں سے اس کے پاپا گزر کر گئے تھے اسی راستے پر نظر ڈالتی ہوئی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔

”ارے یہ تو جہاں بھی جاتے ہوں گے داستان چھوڑ آتے ہوں گے۔“

”ہیں! دماغ صحیح ہے تمہارا؟ تم نے میرے پاپا کو ایسا کیسے سمجھ لیا۔“

”توبہ کرو، میں انہیں کیوں ایسا سمجھوں گی۔ میرا مطلب ہے یہ تو عنوان ہیں، داستانیں خود انہیں ڈھونڈتی ہوں گی۔“

میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ہونقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگی تھی۔

اس کے بعد بھی میری ان سے دو تین بار سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔ اور ہر بار ان سے مل کر میں ان کے بارے میں ایسی ہی باتیں کر کے سنیعہ کو تنگ کرتی تھی۔ ایک بار میں نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

”سنو! پاپا کی شادی کروادو! کچھ اکیلے اکیلے سے لگتے ہیں۔“

ہر انداز، ہر بات خوشگوار تاثر کے ساتھ ذہن پر نقش ہو جائے۔

پھر اسکول کے بعد کالج میں آکر ہماری دیگر سرگرمیوں میں اضافہ ہو گیا۔ ڈبٹس کے مقابلے ہوں، موسیقی کے، گیمز یا کالج میں ڈرامہ، میں اور سنیعہ آگے آگے ہوتے۔ اس کے باوجود ہمارا تعلیمی ریکارڈ کبھی خراب نہیں ہوا۔ شاید پرنسپل ٹھیک کہتے تھے کہ شرارتی بچے ذہین بھی ہوتے ہیں، یہ بات کم از کم ہم دونوں پر صادق آتی تھی۔

بہر حال سنیعہ اور میری دوستی اسکول کے زمانے سے تھی اور ظاہر ہے ہمارے مابین ہر موضوع پر بات ہوتی تھی۔ جب اس کا اپنے عم زاد خرم کے ساتھ فیئر چلا تو وہ ایک ایک بات مجھے بتاتی تھی اور ایک دو بار مجھے اس سے ملوایا بھی۔ وہ اچھا لڑکا تھا، خوش شکل، خوش مزاج۔ میں نے فراخ دلی سے سنیعہ کی پسند کو سراہا لیکن جب اس نے مجھے بھی ایسا ہی ساتھی ڈھونڈنے کا مشورہ دیا تب میں نے پہلی بار اسے اپنے آئیڈیل کی جھلک دکھائی تھی۔

اس کے بعد اکثر میرا آئیڈیل ہمارا موضوع بنا، لیکن اب تک مجھے ایسا شخص نہیں ملا جس میں تمام نہیں تو کچھ کم میرے آئیڈیل کی خوبیاں موجود ہوں اور جو ملے انہیں میں اپنا آئیڈیل تو نہیں کہہ سکتی کیونکہ ان سب کے ساتھ میرا ایک احترام کا رشتہ پہلے سے موجود تھا۔ یعنی منجھلے چچا، پرنسپل صاحب اور سنیعہ کے پاپا۔

”سنیعہ کے پاپا..... نہیں نہیں ہرگز نہیں، میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“ میں نے تکیے کو ادھر ادھر جھٹکا لیکن میری ذہنی رو بہک گئی۔

اتنے جینٹس، اتنے بنیڈ سم، اسمارٹ..... اُف نہیں!“ میں پریشان ہو گئی اور مدد کے لئے اپنے تخیل کو پکارنا شروع کیا۔

”سنو! سنو کہاں ہو؟“ میرے کمرے میں میری نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔ پھر دھیرے دھیرے میں نے چٹکیں موند لیں۔ تو مخصوص قدموں کی دھمک مجھے اپنے دل پر محسوس ہونے لگی، شاید وہ آ رہا تھا۔ اس کی آمد ایسے ہی ہوتی تھی۔ ایک کیف آگیا سا احساس! میرے

نے سمجھ لیا کہ بات یہیں ختم ہوگئی۔ یعنی سنیعہ دوبارہ اس سلسلے میں مجھ سے کچھ نہیں کہے گی البتہ میری گالیوں کی منتظر ہوگی۔ اور میں دل ہی دل میں اسے گالیاں دینے لگیں اس لئے نہیں کہ مجھے اس کی بات بری لگی تھی بلکہ اس لئے کہ اس نے مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی ٹیبل پر میں کافی سست سی تھی۔ جانے رات کیا کچھ سوچتی رہی تھی شاید اپنی سوچوں کا اثر تھا اور بھابھی جانے کیا سمجھیں۔ ناشتے کے بعد بھیا کے آفس جاتے ہی میرے پاس آکر کہنے لگیں۔

”گلتا ہے کل والے پروپوزل کے بارے میں تم کچھ زیادہ ہی سوچتی رہی ہو۔“

میں اپنی جگہ اچھل پڑی کیونکہ فوری طور پر میرے ذہن میں سنیعہ کا خیال آیا اس نے بھی تو پروپوزل ہی کیا تھا۔ اور یہ کہ بھابھی کو کیسے پتا چلا۔ میرے اچھلنے پر بھابھی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

”دیکھا میں نے کیسے سمجھ لیا۔ اب جلدی سے بتاؤ کیا فیصلہ کیا۔“

میری حالت ایسی تھی کہ اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا تھا۔ آنکھیں پوری کھلی ہوئی، پلکیں بھی نہیں جھپک رہی تھیں۔

”ہائیں! میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں کیا۔“

بھابھی نے باقاعدہ اپنا سر چھو کر دیکھا، پھر پوچھنے لگیں۔

”اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟“

”وہ.....“ پلکیں جھپکتے ہی میں ٹپٹا گئی۔ ”کچھ نہیں!“

”کیا کچھ نہیں۔“

”مجھے اس لڑکے کے بارے میں بتاؤ۔ جسے کل گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔ کیسا لگا

تہیں؟“

”تم ہمیشہ تو ان کے ساتھ نہیں ہوگی۔ اگر ہو تب بھی ان کی شریک حیات ضرور ہونی چاہئے۔ جس کے ساتھ وہ اپنے دکھ سکھ شیئر کر سکیں۔“ میری بات سمجھ کر وہ پرسوج انداز میں بولی تھی۔

”ہاں! لیکن اب ان کی شادی کہاں ہو سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں ابھی بھی جس کی طرف اشارہ کر رہی ہو وہی ان کی.....“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ چڑ کر بولی تھی۔

”پاگل ہو تم! میں پاپا کی بات کر رہی ہوں۔ جب انہیں شادی کرنی چاہئے تھی اس

وقت نہیں کی تو اب کیا کریں گے۔“

”ہو سکتا ہے انہیں کسی نے کہا ہی نہ ہو اور ابھی بھی بیچارے اسی انتظار میں ہوں۔“

”جی نہیں۔ چھو پھو تو ابھی بھی کہتی ہیں لیکن پاپا بہت ناراض ہوتے ہیں۔ اور ٹھیک

ناراض ہوتے ہیں۔ اب بھلا شادی کی کیا تک ہے؟“

”ہاں اب تو انہیں تمہاری شادی کرنی ہے۔“

یوں بات آئی گئی ہوگئی تھی بہر حال وہ سب ایک مذاق تھا۔ لیکن آج مذاق نہیں تھا۔ اور

مجھے بھی ہرگز سنیعہ کی سوچ سے اختلاف نہیں تھا۔ اس کی جگہ اگر میں ہوتی تو میں بھی یہی سوچتی کہ

میرے جانے سے پاپا تنہا ہو جائیں گے اس لیے..... لیکن سنیعہ نے میرے بارے میں سوچ

کر سچ مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ اس کے پاپا مجھے اچھے لگتے تھے میں انہیں آئیڈل لائز کرتی تھی لیکن ایسا تو

میرے گمان میں بھی نہ تھا بلکہ میں گمان کر ہی نہیں سکتی تھی۔

اس وقت تو شخص اس خیال سے کہ نہیں سنیعہ برا نہ مان جائے میں نے کوئی بھی سخت

بات کہنے سے خود کو باز رکھا تھا۔ پھر اس نے یہ بھی تو کہہ دیا تھا کہ اگر مجھے اس کی بات بری لگے تو وہ

اپنے الفاظ واپس لیتی ہے۔ اس کے بعد ظاہر ہے میرا خاموش رہنا ہی بہتر تھا اور اپنے طور پر میں

”آئی میں توبہ کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ شام میں میرے گھر ایک تقریب ہے اس کے بعد میں خود اسے چھوڑ جاؤں گی۔“

”تو یہ شام میں آجائے گی۔“ امی نے کہا تو اس نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”مہمانوں کی طرح.....“ پھر وہی لجاجت۔ ”نہیں آئی ابھی بھیج دیں۔ آپ کو پتہ ہے میں اکیلی ہوں یہ میرا ہاتھ بٹائے گی۔“

”تقریب کی نوعیت کیا ہے؟“ بھابھی نے یونہی پوچھ لیا۔ اور وہ فوراً بولی۔

”میں نے اپنی تمام دوستوں کو کھانے پر بلایا ہے۔“

امی اور بھابھی شاید اس کے جواب سے مطمئن ہو گئیں لیکن میں الجھ گئی۔ پھر امی کی اجازت ملنے پر میں شام میں پہننے کے لئے ایک سوٹ شاپر میں ڈال کر اس کے ساتھ باہر آئی، تب بھی میں اندر ہی اندر الجھ رہی تھی لیکن خود سے کوئی سوال نہیں کیا۔

حسب عادت اس نے کیسٹ آن کرنے کے بعد گاڑی اشارٹ کی۔ پھر مر میں مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔

”تم کن سوچوں میں ہو؟“

”میں تمہاری دوستوں کو سوچ رہی ہوں۔ کس کس کو بلایا ہے؟“ میرے مشکوک انداز پر وہ ہنس پڑی۔

”صرف تمہیں۔“

”اس کا مطلب ہے کوئی تقریب نہیں ہے۔ امی سے تم نے جھوٹ کہا۔“

”بھنڈا جھوٹ نہیں آج میرے پاپا کی برتھ ڈے ہے اور میں زبردست اہتمام کرنا چاہتی ہوں۔“

اس کے چہرے لہجے اور انداز کہیں بھی کل کی بات کا شائبہ نہیں تھا۔ بلکہ اس سے پہلے جیسے وہ اکثر اپنے پاپا کا ذکر کرتی تھی وہی انداز تھا۔ اس کے باوجود میں نظریں چرا کر شیشے سے باہر

”اوہ!“ میں نے گہری سانس کھینچی۔ ”اس کے بارے میں پوچھ رہی ہیں آپ!“

”تم کیا سمجھیں؟“

”میں..... میں بھی یہی سمجھی۔ نہیں بالکل نہیں۔ میرا مطلب ہے صاف منع کر دیں۔“

بوکھلاہٹ میں میں ٹھیک سے بول بھی نہیں سکی۔

”صاف منع کر دیں لیکن کیوں.....؟“

”بس مجھے اچھا نہیں لگا..... اب خدا را یہ مت پوچھئے گا کہ کیوں نہیں اچھا لگا۔“ میں نے کہا تو بھابھی لا پرواہی سے کندھے اچکا کر بولیں۔

”نہیں پوچھوں گی اب اگر کوئی اور ہے تو اس کے بارے میں خود ہی بتا دو۔“

”کوئی نہیں ہے۔“

”سچ کہہ رہی ہو؟“

بھابھی نے کھوجتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ان کے ساتھ کمرے سے نکل کر آئی اور امی سے دوپہر کے کھانے میں کیا کچے گا پوچھ

رہی تھی کہ سنیعہ آگئی۔ گو کہ اس کی آمد غیر متوقع نہیں تھی۔ اکیلی ہونے کی وجہ سے وہ جب بھی

گھبراتی میرے پاس چلی آتی تھی۔ اور اکثر دن میں دوبار بھی آ جاتی تھی۔ بہر حال اس وقت اسے

دیکھ کر میں کچھ ٹھٹھک سی گئی اور بلا ارادہ پوچھ لیا۔

”خیریت! اس وقت کیسے آنا ہوا.....؟“ اور میرا سوال اس کے لئے غیر متوقع تھا جیسا

جیران ہو کر بولی۔

”میرے آنے کا کوئی وقت تو مقرر نہیں ہے۔“

”آؤ میرے کمرے میں چلو!“ میں بات بدل گئی۔ تو وہ امی کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

”نہیں! میں تمہیں لینے آئی ہوں۔“ پھر فوراً امی کے گلے میں بازو ڈال کر منت سے

بولی۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ وہ سرسری انداز میں کہتے ہوئے وہیں بیٹھنے لگے کہ سنیہ نے ٹوک

دیا۔

”یہاں نہیں بیٹھیں پاپا!“ انہوں نے کچھ حیران ہو کر مجھے دیکھا پھر سنیہ سے کہنے

لگے۔

”میرا خیال ہے آپ کی اس دوست سے میں پہلے مل چکا ہوں۔“

”میں اس کی وجہ سے یہاں بیٹھنے سے منع نہیں کر رہی۔“ سنیہ سمجھ کر بولی۔

”پھر.....؟“

”بس آپ اپنے کمرے میں جائیں۔ کچھ دیر آرام کریں پھر تیار ہو کر آئیں ہم آپ کو

سرپرائز دیں گے۔“ سنیہ نے کہا۔

”سرپرائز.....!“ وہ غالباً اپنے طور پر قیاس کرنے لگے۔

”جائیں ناں پاپا.....!“ سنیہ نے انہیں سوچنے نہیں دیا تب وہ ذرا سے کندھے اچکا

کراپنے کمرے میں چلے گئے۔ تو سنیہ میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتی ہوئی بولی۔

”چلو، ہم بھی تیار ہو جائیں۔“

سنیہ کا اصرار تھا، میں اس کا جھلملاتا ہوا سوٹ پہنوں لیکن مجھے اچھا نہیں لگا۔ جلدی

سے منہ ہاتھ دھو کر جو کپڑے اپنے ساتھ لائی تھی وہی پہن لئے۔ بالوں میں برش کر کے یونہی کھلا

چھوڑ دیا اور میک اپ کے نام پر ہلکی سے لپ اسٹک..... سنیہ چیختی رہ گئی یہ کروہ کرو لیکن میں نے

اس کی ایک نہیں سنی۔ واقعی کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اگر اور بہت سارے لوگ ہوتے تو بات بھی

تھی یا پھر وہ بات نہ ہوئی ہوتی تو میں بھی سنیہ کی طرح بھرپور تیاری کے ساتھ صاحب بہادر کو وٹس

کرتی۔ اور اب میرا جھگھکنا ایک فطری امر تھا۔

تیاری کے بعد سنیہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ ہم نے سارا انتظام اور سجاوٹ

وہیں کی تھی۔ ڈرائنگ ٹیبل پر دیگر لوازمات کے ساتھ کیک، موم بتیاں، دیوار پر پٹی برتھ ڈے کا

دیکھنے لگی۔

اگر کل شادی والی بات نہ ہوئی ہوتی تو آج کا دن سچ سچ میں بہت انجوائے کرتی

کیونکہ گھر میں ہم دونوں ہی تھے۔ ملازمہ اور خانساں تو کچن میں مصروف تھے۔ سنیہ نے آتے

ہی ڈیک پر میرے پسندیدہ گانوں کا کیسٹ لگا دیا پھر بھی میرا ادھیان ادھر ادھر نہیں ہوا۔ سارا وقت

گھبراہٹ طاری رہی جسے سنیہ سے چھپانا بھی ضروری تھا۔ اسی کوشش میں مجھ سے جانے کیسی

کیسی حرکتیں سرزد ہوئیں۔ وہ کھلکھلا کر ہنسی تو مجھے غصہ آ گیا۔

”یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے لگتا ہے تمہارا ادھیان کہیں اور ہے۔“ بالآخر اس نے مجھے ٹوک ہی

دیا۔ اور مجھے بروقت جواب سوجھ گیا۔

”اصل میں میں پریشان ہوں۔“

”کیوں.....؟“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر میری طرف متوجہ ہو گئی تو میں نے اسے کل

والے پروپوزل کے بارے میں بتا کر کہا۔

”امی کو وہ لڑکا بہت پسند آیا ہے اور وہ چاہتی ہیں میں فوراً ہامی بھریوں۔“

”اور تم کیا چاہتی ہو.....؟“

اپنے چہرے پر جی اس کی نظریں مجھے بری طرح محسوس ہو رہی تھیں۔ کم بخت جیسے میرا

پوسٹ مارٹم کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کیا کہوں۔ بات کا رخ موڑنا چاہتی تھی کہ وہ

زور دے کر بولی۔

”بتاؤ ناں! تم کیا چاہتی ہو.....؟“

”میں.....!“ سوچتے ہوئے انداز میں ابھی میں نے اسی قدر کہا تھا کہ اس کے پاپا آ

گئے۔

”ہیلو گرلز!“ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ہمیں ایک ساتھ مخاطب کیا تو سنیہ

ہیلو پاپا کہتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی جبکہ میں اٹھنا بھول گئی۔

”میں ابھی لائی۔“ میں کہہ کر کچن میں آ گئی۔

پھر کھانے پینے سے فارغ ہوتے ہی میں نے سنیعہ کو گھر چھوڑ آنے کو کہا تو وہ مجھے دو منٹ رکنے کا کہہ کر کپڑے بدلنے چلی گئی۔ اس کے پاپا پہلے ہی اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ میں ٹہلتی ہوئی لاؤنج سے نکل آئی۔

شام گہری ہو رہی تھی اور کیونکہ میں امی سے کہہ کر آئی تھی کہ واپسی میں دیر ہو سکتی ہے اس لئے میں مطمئن تھی بلکہ دھیرے دھیرے گنگنائی بھی رہی تھی۔

”کیا بات ہے.....؟“

سنیعہ نے پیچھے سے آ کر میرے بازو میں چٹکی کاٹی۔ اس کے ہونٹوں پر شوخ و معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

”بات یہ ہے مائی ڈیر سنیعہ کہ ابھی میں تمہیں بے شمار گالیاں دینے والی ہوں۔“ میں نے کہا تو وہ ٹھٹھک کر بولی۔

”خیریت؟“

”خیریت ہی تو نہیں ہے، چلو.....!“ میں نے اسے آگے دھکیل دیا۔

پھر تمام راستے وہ پوچھتی رہی کہ کیا ہوا، گالیاں کس سلسلے میں لیکن میں ٹالتی رہی اور جب گھر کے سامنے اتری تب اس کی طرف جھک کر بولی۔

”تم الو ہو..... یہ بتاؤ کہ میں تمہاری می بن کر کیسی لگوں گی؟“

اس نے ایک پل کو میری آنکھوں میں دیکھا پھر چیخ پڑی۔

”سچ تو یہ!“

اور یہی سچ تھا جسے میں خود نہیں جھٹلا سکی تھی کہ اوّل عمر میں میں نے جو ایک خیالی پیکر تراش کر اسے اپنی سب سے بڑی آرزو بنا لیا تھا۔ سنیعہ کے پاپا احسن آفندی اسی کا پرتو تھے۔ اگر پہلی بار سنیعہ نے انہیں اپنے پاپا کی حیثیت سے متعارف نہ کروایا ہوتا تو اسی وقت میرے دل کی

بیز سنیعہ ایک ایک چیز کا جائزہ لینے کے بعد اپنے پاپا کو بلانے چلی گئی تو اچانک یاد آنے پر میں جلدی سے فریج سے پھول نکال لائی اور گلدستے میں سجا رہی تھی کہ سنیعہ انہیں لے کر آ گئی اور آتے ہی پی پی برتھ ڈے گانا شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا اطراف پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد ان کے ہونٹوں پر مبہمی مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔ بے خیالی میں میں انہیں دیکھے گئی۔

”اپنے آئیڈل میں جو خوبیاں تم بتاتی ہو کیا میرے پاپا میں وہ سب نہیں ہیں!“

سنیعہ نے غلط نہیں کہا تھا اور اس وقت اچانک جیسے میرے خوابوں کو زندگی مل گئی۔ دل نے اعتراف کیا اور میں نے بے اختیار ایک پھول نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔

”سریہ آپ کے لئے.....!“ انہوں نے چونک کر دیکھا۔

”تھینک یو!“ پھر فوراً سنیعہ کی طرف متوجہ ہو گئے جو موم بتیاں روشن کر رہی تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہیں دیکھ کر بولی۔

”چلیں پاپا! اب آپ جلدی ایک کاٹیں۔“

انہوں نے چھری اٹھا کر بس کیک پر رکھنے کا تکلف کیا پھر کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولے۔

”باقی کام اب خود کر لو۔“

سنیعہ غالباً ان سے واقف تھی۔ اس لئے بغیر کسی احتجاج یا اصرار کے خود ہی پھونک مار کر موم بتیاں بجھائیں پھر کیک کاٹ کر پلیٹ میں نکالتی ہوئی مجھ سے بولی۔

”تم کھڑی کیوں ہو بیٹھو ناں!“

”نہیں میں چائے لے کر آتی ہوں۔“

ان کی نظریں ٹیبل پر غالباً اسی چیز کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں۔ میں نے کہا تو وہ چونک کر بولے۔

”ہوں! میں یہی سوچ رہا تھا کہ کس چیز کی کمی ہے۔“

”اور میں اس جال سے نکلنا نہیں چاہتی۔“ میں بے اختیار کہہ گئی۔ جس پر وہ آہ بھر کر بولی تھیں۔

”اللہ تم پر رحم کرے!“

☆☆☆

پتہ نہیں کیسے میں نے آپ سمجھ لیا کہ احسن آفندی مجھے سراہیں گے نہ محبت کا اظہار کریں گے، بلکہ شاید انہیں میری اتنی جھج اچھی بھی نہ لگے، اس لئے ان کے آنے سے پہلے میں نے ڈرینگ روم میں جا کر حلیہ بدل لیا۔ اچھا سا سوٹ پہن کر نکلی پھر منہ ہاتھ دھونے کے خیال سے واش روم کی طرف جا رہی تھی کہ ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ کھلنے پر میں بلا ارادہ ہی رک کر اس طرف دیکھنے لگی۔ اگلے پل آفندی نے اندر داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازہ بند کیا تو میرا دل یکبارگی بہت زور سے دھڑکا اور فوری طور پر سمجھ میں بھی نہیں آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔

انہیں دیکھتے ہی میں نے سر جھکا لیا تھا۔ اس لئے یہ ہی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ یونہی سر جھکائے ہوئے میں نے ذرا سی پلکیں اٹھائیں تو ان کے جوتے نظر آئے۔ وہ وہیں دروازے کے پاس رک گئے تھے اور پتہ نہیں یہ درمیانی فاصلہ کسے طے کرنا تھا۔ کم از کم مجھ میں تو اتنی ہمت نہیں تھی۔

کتنے لمحے سر کر گئے۔ تب میں نے بہت کوشش سے سرو نچا کر کے انہیں دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ دبی تھی اور شاید وہ میرے دیکھنے کے منتظر تھے۔ فوراً درمیانی فاصلہ سمیٹ کر دھیرے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”آپ حیران ہیں یا پریشان.....؟“

”جی.....؟“ میں حیران نہیں بھی تھی تو ہو گئی بھلا یہ کیا سوال تھا۔ تب وہ وضاحت کرتے ہوئے بولے۔

”آپ کا یہاں کھڑے ہونے کا انداز یہ ظاہر کر رہا ہے جیسے سوچ رہی ہوں کہ میں

دنیا تہ وبالا ہو جاتی اور میں یقین سے سوچتی کہ میرے خوابوں سے نکل کر اچانک وہ شخص میرے سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔ لیکن درمیان میں سنیعہ تھی۔

امی، بھیا، بھابھی سب کو اسی بات پر اعتراض تھا۔

”جوان بیٹی کا باپ ہے لوگ کیا کہیں گے!“

”مجھے لوگوں کی پروا نہیں۔“ میں نے بھابھی سے کہا تھا۔

”لیکن تم میں کیا کمی ہے۔ اتنے اچھے اچھے رشتے موجود ہیں ان سب کو چھوڑ کر تم

ایک.....“

”بھابھی جب آپ لوگوں نے فیصلہ مجھ پر چھوڑا ہے تو پھر جرح کیسی۔“ میں نے ٹوک

کر کہا تو بھابھی گہری سانس کھینچ کر بولیں۔

”میں جرح نہیں کر رہی۔ سمجھنا چاہتی ہوں تمہیں۔“

”کیا سمجھائیں گی یہی کہ وہ مجھ سے دو گنی عمر کے ہیں جوان بیٹی کے باپ ہیں اور

کیا.....؟“

”اور یہ کہ وہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتے نہ وہ محبت جو تم چاہو گی اور نہ.....“ بھابھی ایک

دم خاموش ہو گئیں اور ان کی خاموشی میں جانے کیا تھا کہ میں ٹوکے بغیر نہیں رہ سکی۔

”رک کیوں گئیں، کہئے ناں.....!“

”اولاد..... اولاد نہیں دے سکتے وہ تمہیں۔ اس لئے کہ ان کی پہلے سے اولاد موجود ہے

اور وہ بھی جوان، سمجھ رہی ہوناں۔“

میں کچھ سمجھی کچھ نہیں پھر بھی اثبات میں سر ہلا دیا تو کہنے لگیں۔

”اس کے باوجود تم شادی کرنا چاہتی ہو..... آخر کیوں؟“ میں نے سر جھکا لیا تو ذرا سا

ہنس کر بولیں۔

”گلتا ہے باپ بیٹی نے تمہیں اپنے جال میں پھانس لیا ہے۔“

”تم چائے نہیں پیو گی؟“

”نہیں میں خالی پیٹ چائے نہیں پیتی۔“

”تو جاؤ سنیعہ اٹھ گئی ہوگی اس کے ساتھ ناشتا کرو۔“

انہوں نے ٹرائی سے اخبار اٹھاتے ہوئے کہا، تو میں کچھ جڑبڑ ہو کر بولی۔

”اور آپ.....؟“

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ یکسر ان سنی کر کے گھٹنوں پر اخبار پھیلا کر اس میں مصروف ہو گئے۔ تب میں نے پہلے ڈرینگ روم میں آ کر اچھے بالوں کو سلجھا کر چوٹی کی شکل دی اور ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک لگا کر کمرے سے نکل آئی۔

سنیعیہ کی آواز ڈانگ روم میں سے آرہی تھی۔ پتہ نہیں کس سے باتیں کر رہی تھی اس لئے میں نے فوراً اندر جانے کی بجائے پہلے جھانک کر دیکھا اور اسے ملازمہ کے ساتھ مغز ماری کرتے دیکھ کر ہنستی ہوئی اندر آ کر بولی۔

”صبح صبح کیسا ہنگامہ ہے۔“ میری آواز پر سنیعیہ اچھل کر میری طرف پلٹی۔

”ہائیں تم..... سوری آپ یہاں کیوں آ گئیں؟“

”اوہ تو اب میں آپ جناب ہو گئی!“ میں نے گردن اکڑائی، پھر کرسی کھینچ کر بیٹھنے ہوئے پوچھا۔

”میں یہاں کیوں نہیں آ سکتی؟“

”میرا مطلب یہ نہیں ہے.....“

”پھر.....؟“

”میں آپ کے لئے وہیں ناشتا بھجوا رہی تھی۔“

”اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں یہیں تمہارے ساتھ ناشتا کروں گی۔“ میں

نے کہا ساتھ ہی ملازمہ کو ناشتالانے کا اشارہ کیا تو سنیعیہ میرے پاس آ کر بولی۔

کہاں آ گئی؟“

میں نے بے ساختہ ہنسی کے بعد کہا۔

”میں ایسا کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔“

”اچھا، لیکن میں ضرور سوچ رہا ہوں۔“ وہ اسی طرح مجھے کندھے سے تھامے ہوئے

بیڈ پر آ کر بیٹھے تو ایک دم سنجیدہ ہو کر بولے۔

”کیا.....؟“

”کہ تمہیں شادی کا مشورہ کس نے دیا، آئی مین میرے ساتھ!“

”میرے دل نے؟“ میں نے بے اختیار کہہ کر نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ تو ہلکی سی

مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

”یہ مشورہ دل کا ہی ہو سکتا ہے۔“

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر صوفے پر جا بیٹھے اور جھک کر اپنے شوز اتارنے لگے جبکہ

میں منتظر تھی کہ وہ اپنے دل کی کہیں گے لیکن شوز اتارنے کے بعد وہ ڈرینگ روم میں چلے گئے۔

صبح بڑی اجلی بڑی نکھری نکھری تھی۔ میں نے کھڑکی سے پردے ہٹا دیئے پھر پلٹ کر

دیکھا آفندی سو رہے تھے۔ پتہ نہیں ان کی روٹین کیا تھی۔ میں نے بہر حال انہیں اٹھایا نہیں اور

ڈرینگ روم سے اپنے کپڑے لے کر واش روم کا رخ کیا۔ اور جب میں شاور لے کر نکلی تو

دروازے پر ہلکی ہلکی سی دستک ہو رہی تھی، میں نے بڑھ کر ذرا سادروازہ کھولا۔ سامنے ملازمہ چائے

کی ٹرائی لئے کھڑی تھی۔ ٹرائی اندر کھینچ کر میں نے دوبارہ دروازہ بند کر لیا۔

مجھے بیڈٹی کی عادت نہیں تھی۔ اس لئے ایک کپ میں چائے بنا کر میں نے تکیے پر

رکھے ان کے ہاتھ کو ذرا سا ہلایا تو انہوں نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ نظروں کے عین سامنے میں

تھی، بس ایک نظر..... پھر فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے اور میرے ہاتھ سے کپ لے کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

معاً احساس ہونے پر پوچھنے لگے۔

”چلو اٹھو! تمہیں پاپا کے ساتھ ناشتا کرنا ہے۔“

”میرا خیال ہے پہلے تم اور تمہارے پاپا طے کر لو کہ مجھے کس وقت کس کے ساتھ کیا کرنا ہے۔“ میں نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر کرسی کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے یوں کہا جیسے اب ان دونوں کے طے کرنے کے بعد ہی مجھے ناشتا ملے گا۔

”کیا مطلب؟“ ظاہر ہے وہ سمجھی نہیں۔

”مطلب بھی اپنے پاپا سے پوچھو۔“

”نہیں تم بتاؤ۔“ وہ کچھ متوحش سی ہو کر فوراً کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تو مجھے ہنسی آ گئی۔

”کیا بتاؤں؟“

”پاپا نے کچھ کہا ہے؟“ اس نے جانے کس خیال کے تحت سہم کر پوچھا۔ اور میں نے

اسی قدر اطمینان سے جواب دیا۔

”ہاں! انہوں نے کہا ہے میں تمہارے ساتھ ناشتا کر لوں اور میرا خیال ہے انہوں نے ٹھیک کہا ہے۔ کیونکہ تمہیں تو باپ کی شادی کرواتے ہوئے شرم نہیں آئی لیکن انہیں تمہارے سامنے میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے یقیناً شرم آئے گی۔“

آخر میں ہلکے ہلکے انداز میں جو میں خود سمجھی تھی اسے بھی سمجھا دیا تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ میں نے گھور کر دیکھا تو ٹیبل کی طرف اشارہ کرتی ہوئی فوراً بولی۔

”چلو ناشتا کرو۔“

☆☆☆

سنیچہ کو اب کوئی فکر نہیں رہی تھی کہ اس کی شادی کے بعد اس کے پاپا اکیلے ہو جائیں گے۔ اس لئے اب وہ شدت سے خرم کی منتظر تھی۔ اور اسے کینیڈا جانے کا شوق بھی تھا۔ ان دنوں اس کے پاس بس یہی ایک موضوع تھا۔ میں کوئی بھی بات کرتی جواب میں وہ اپنا کینیڈا جانا لے بیٹھتی۔

اس شام اس کے تایا اور تائی آئے تو انہوں نے ایک ہفتے بعد خرم کے آنے کا مشرہ سنا کر اسی وقت آفندی سے شادی کی تاریخ طے کرنے کو کہا تو آفندی جانے کیا سوچے ہوئے تھے کہنے لگے۔

”جلدی کیا ہے! خرم کو تو آنے دیں پھر تاریخ بھی طے کر لیں گے۔“

”خرم چھٹی پر آ رہا ہے۔“ سنیچہ کے تایا زور دے کر بولے۔

”اس لئے میں چاہتا ہوں ہم تیاری کر رکھیں اس کے آتے ہی شادی کریں گے تو کچھ وقت دلہن ہمارے پاس رہ سکے گی ورنہ وہ تو اسے لے کر چلا جائے گا۔“

”تیاری میں کیا وقت لگتا ہے۔ خرم آجائے پھر دیکھیں گے۔“

آفندی اپنی بات پر قائم رہے اور میں اس وقت تو ان کی باتوں میں دخل نہیں دے سکی البتہ رات میں موقع ملے ہی میں نے ان سے پوچھ لیا۔

”آفندی! جب سنیچہ کی شادی خرم کے ساتھ ہونی طے ہے تو پھر آپ نے تاریخ کیوں نہیں دی؟“

”سنیچہ کی شادی خرم کے ساتھ ہونی طے ہے۔“ انہوں نے میری بات دہرا کر مجھے دیکھا پھر پوچھنے لگے۔ ”یہ تم سے کس نے کہا؟“

”کیوں کیا سنیچہ کی مگنی نہیں ہوئی۔“ مجھے سنیچہ کا نام لینا اچھا نہیں لگا اس لئے میں نے بات کو ذرا گھما دیا تو وہ پرسوج انداز میں بولے۔

”ہوں یہ دو سال کی بات ہے۔“

”تو آپ کے خیال میں اتنی مدت گزرنے پر مگنی آپ ہی آپ ختم ہو جاتی ہے۔ میرے کچھ جذباتی ہو کر کہنے پر انہوں نے چونک کر دیکھا پھر محظوظ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”نہیں! اپنے آپ تو کوئی رشتہ ختم نہیں ہوتا۔“

نہیں۔ اور ایسا ظاہر ہے میں سنیعہ کی محبت میں کر رہی تھی۔ مجھے پتہ تھا وہ دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ اور زیادہ نہیں تو کچھ کچھ میں آفندی کو سمجھنے لگی تھی میں نے جان لیا تھا کہ اگر خرم ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تو وہ سنیعہ کی شادی ہرگز اس کے ساتھ نہیں کریں گے۔

کھانا بہت خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ اس کے بعد جب چائے کا دور چلا تو اسی دوران خرم کے والدین نے شادی کی بات چھیڑ دی۔ اور جب میں نے سنا آفندی ایک ہفتے بعد کی تاریخ رکھنے پر آمادہ ہو گئے ہیں تب میں بہت خوش ہو کر فوراً سنیعہ کے کمرے میں آئی لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی سمجھ گئی کہ وہ خود ساری بات سن چکی ہے۔

”تو تم چوری چوری سن رہی تھیں؟“ مجھے اس کے چہرے پر چمکتی مسکراہٹ بہت پیاری لگی۔

”چوری چوری سننے کا مزا آتا ہے۔ حالانکہ مجھے پتہ تھا کہ تم پہلی فرصت میں میرے پاس بھاگی آؤ گی۔“ وہ ہنستی ہوئی بولی۔

”شرم کرو!“ میں نے اسے گھورنا چاہا لیکن مجھے بھی ہنسی آ گئی۔

اور پھر اگلے دن سے ہمارے بازاروں کے چکر شروع ہو گئے، گوکہ خرم اور اس کے والدین نے بھی جہیز خصوصاً بڑے آئینے دینے سے منع کر دیا تھا کیونکہ ان دونوں کو یہاں نہیں رہنا تھا۔ پھر بھی کپڑے، جیولری، میک اپ کا سامان وغیرہ ان سب چیزوں کی خریداری کے لئے بھی وقت بہت کم تھا۔

پتہ نہیں آفندی نے کیسے کہہ دیا تھا کہ تیاری میں کیا وقت لگتا ہے۔ اب خود بھی بوکھلائے ہوئے تھے۔ اور انہیں میری ناتجربہ کاری کا احساس بھی تھا۔ اسی لئے میری کسی کوتاہی یا غلطی پر ٹوکنے اور موڈ خراب کرنے کی بجائے انہوں نے یکسر نظر انداز کر دیا۔ یہاں تک کہ رخصتی کے وقت مجھ سے خاصی جماعتیں سرزد ہوئیں اور اس وقت بس ایک بار انہوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ میں سچ سچ ڈر گئی اور میرا خیال تھا بعد میں وہ مجھے ضرور سرزس لریں گے لیکن وہ شاید بھول

”پھر..... میرا مطلب ہے آپ کیا چاہتے ہیں؟“

سنیعہ کی محبت سے واقفیت کی بنا پر ہی مجھے یہ خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں وہ اس رشتے کو ختم تو نہیں کرنا چاہتے۔

”میں صرف اپنا اطمینان چاہتا ہوں۔“ پہلے خود کلامی کا انداز پھر وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگے۔

”خرم گزشتہ دو سالوں سے کینیڈا میں ہے۔ گوکہ وہ جلد کسی دوسرے ماحول کا اثر قبول کرنے والا نہیں ہے پھر بھی جب تک میں اسے دیکھ اور اس سے مل نہ لوں سنیعہ کی شادی نہیں کر سکتا۔“

”یہ بات ہے۔“ میں جیسے اندیشوں سے نکل کر بولی۔

”اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکرائے، پھر پوچھنے لگے۔

”تم کیوں پریشان ہو گئی تھیں؟“

”نہیں تو؟“ میں صاف مکر گئی۔ اب انہیں سنیعہ کی بے قراریاں تو نہیں سنا سکتی تھی۔

پھر ایک ہفتے کی بات تھی جو کہ بڑی جلدی گزر گیا۔ جس روز خرم آیا اسی رات وہ سب گھر والے ہمارے ہاں کھانے پر مدعو تھے اور کیونکہ کافی اہتمام کرنا تھا اس لئے میں آفندی کے ساتھ خرم کو ریسو کرنے نہیں جاسکی۔ یوں بھی میں پہلے اس سے مل چکی تھی اس لئے وہ جو ایک اشتیاق ہوتا ہے کہ کیسا ہو گا وہ بھی نہیں تھا۔ البتہ رات میں جب وہ سب گھر والوں کے ساتھ آیا تو مجھے دیکھ کر کسی طرح اپنی حیرت چھپا نہیں سکا۔

”آپ.....“

”بیگم احسن آفندی!“ میں نے فوراً اپنا تعارف کروا کر اسے مزید حیرت میں تو ڈالا

ساتھ ہی مزید کچھ کہنے سے روک دیا تھا۔

پھر ساری رات میں آفندی کو دیکھتی رہی کہ آیا خرم سے مل کر وہ مطمئن ہوئے کہ

گئے۔

”پاگل ہو تم بالکل!“ میں شاید ان کی بات سمجھی نہیں تھی۔ جس پر وہ جھنجھلا گئیں۔
 ”تمہیں سنیعہ کے ساتھ زندگی نہیں گزارنی اور اس کی موجودگی میں تمہاری زندگی
 خوبصورت نہیں ہو سکتی تھی۔“

”پتہ نہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“ میں بھی جھنجھلا گئی۔

”بے وقوف لڑکی! تمہیں اتنا اندازہ نہیں کہ اس کی موجودگی میں آفندی کتنے ریزرو
 رہتے ہوں گے۔ ہر دم یہ خیال کہ گھر میں جوان بیٹی موجود ہے۔ اب کم از کم یہ تو نہیں ہوگا۔ تم
 آزادی سے ان کے ساتھ آجا سکوگی۔ اٹھنے بیٹھنے میں بھی وہ تکلف نہیں ہوگا۔“

بھابھی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا تو میری نظروں میں وہ سارے منظر آئے
 جب سنیعہ کی موجودگی میں آفندی قصداً مجھے نظر انداز کر جاتے۔ اور ابھی تک تو میں نے محسوس نہیں
 کیا تھا۔ ایک طرح سے یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ کسی بد مزگی سے پہلے ہی سنیعہ اپنے گھر کی ہو گئی تھی۔
 میں نے بھابھی کو دیکھ کر مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ تو وہ ہنس کر بولیں۔

”اب سمجھیں؟“

”آپ کے سمجھانے سے، لیکن بھابھی میرا خیال ہے آفندی میں کوئی تبدیلی نہیں آئے
 گی۔ اور میں نے بھی انہیں ان کے اسی لئے دیئے انداز کے باعث پسند کیا ہے۔“
 ”میں جانتی ہوں لیکن میری جان یہ ساری باتیں صرف سوچنے کی حد تک اچھی لگتی
 ہیں۔ مجھے لگتا ہے ابھی تک تم اپنے خوابوں کی دنیا سے نکلی نہیں ہو۔“

”میرے خوابوں کو زندگی مل گئی ہے بھابھی! اور کیا چاہئے مجھے۔“ میں نے ایمان داری
 سے اعتراف کیا۔ حقیقتاً میرے اندر کوئی خلش نہیں تھی۔ بھابھی بس مجھے دیکھ کر رہ گئیں۔

پھر دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے کچھ وقت امی کے ساتھ گزارا۔ اس کے بعد گھر
 چلی آئی کیونکہ ایک تو میں آفندی سے کہہ کر نہیں گئی تھی، دوسرے یہ خیال بھی تھا کہ ہو سکتا ہے شام
 میں سنیعہ اور خرم آجائیں اور واقعی وہ دونوں آ گئے۔ اس وقت تک آفندی آفس سے نہیں لوٹے

سنیعہ کے جانے سے گھر ایک دم سونا ہو گیا۔ آفندی کو تو شاید زیادہ فرق نہیں پڑا۔ اگلے
 دن معمول کے مطابق آفس چلے گئے اور میں بالکل اکیلی ہو گئی۔ گزشتہ ہفتہ جتنی مصروفیات میں
 گزارا تھا اب اتنی فراغت تھی۔ ایک گھنٹے ہی میں میں سخت بور ہو کر امی کے ہاں چلی آئی۔
 ”بیٹی کی شادی سے فارغ ہو گئیں؟“

بھابھی مجھے دیکھتے ہی ہنسیں۔ میں نے ان کے مذاق کا بالکل بھی برائیاں مانا اور انہی
 کے انداز میں بولی۔

”دیکھ لیں بھابھی! اپنی اپنی قسمت ہے۔ آپ کی بیٹی کو بڑا ہونے میں ابھی وقت لگے گا
 اور میں فارغ بھی ہو گئی۔“

”یہ تو ہے۔“ بھابھی نے فوراً تائید کی پھر کہنے لگیں۔

”لیکن اب فارغ رہ کر کیا کرو گی! ایسا کرو ایک دو بچے پیدا کر لو۔ عورت کی زندگی میں
 اگر بچوں کی مصروفیت نہ ہو تو.....“

”سوچوں گی.....“ میں نے بھابھی کی بات پوری ہونے سے پہلے لاپرواہی سے
 کندھے اچکائے۔ یوں بھی ابھی میری شادی کو دو مہینے بھی نہیں ہوئے تھے۔

”سنیعہ خرم کے ساتھ ہی کینیڈا جائے گی یا وہ بعد میں بلائے گا۔“ بھابھی نے خود ہی
 موضوع بدل دیا۔

”اے نہیں بھابھی! خرم سارے انتظام کر کے آیا ہے۔ سنیعہ کو اپنے ساتھ ہی لے
 جائے گا۔“ میں نے بتایا تو بھابھی میرا ہاتھ دبا کر بولیں۔

”تمہارے حق میں یہی اچھا ہے۔“

”کیا اچھا ہے بھابھی! میں تو آج پہلے دن ہی اتنی بور ہو گئی ہوں۔ پتہ نہیں اب
 میرے دن کیسے گزر رہے گے۔“

”لیکن مجھے برا لگے گا! ماں! آنٹی! ساس! اُف.....“

سنیچہ جھنجھلا کر اپنا سر پیٹنے جاری تھی کہ آفندی کی آمد پر اس کا دھیان ہٹ گیا اور میں چائے کے بہانے وہاں سے کھسک آئی۔ خانساں کو رات کے کھانے کے لئے ہدایت دے کر چائے میں بنے خود بنائی اور دیگر لوازمات کے ساتھ لاؤنج میں آئی تو آفندی موجود نہیں تھے۔ شاید چینیج کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خرم نیچے قالین پر گھٹنے ٹیکے سنیچہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے سرگوشی میں جانے کیا کہہ رہا تھا کہ وہ سرخ ہوئی جاری تھی۔ میں بس ایک پل کو ٹھٹھکی پھر کٹ کی آواز نکالی تو دونوں اس بری طرح بوکھلائے کہ میں بے ساختہ زور سے ہنس پڑی۔

”بہت غلط وقت پر آئیں ہیں آپ!“ خرم جھینپ کر بولا اور سنیچہ نے اپنی جھینپ مٹانے کی کوشش کی۔

”نہیں، صحیح وقت پر آئی ہو۔“

”صحیح یا غلط کا فیصلہ بعد میں پہلے چائے۔“ میں نے ٹرائی آگے دھکیلتے ہوئے کہا، تبھی آفندی غالباً میری بات سنتے ہوئے آئے جیہی پوچھنے لگے۔

”کیسا فیصلہ؟“

”کچھ نہیں پاپا۔“ سنیچہ نے فوراً کہہ کر مجھے گھورا لیکن میری ہنسی نہیں رکی۔ آنکھوں میں شرارت چل رہی تھی۔ اور آفندی حسب عادت اچھلتی نظر مجھ پر ڈال کر خرم کی طرف متوجہ ہو گئے گو کہ ان کی نظروں میں تنبیہ تھی نہ سرزنش پھر جانے کیوں میری ہنسی ختم گئی۔

بہت خاموشی سے میں نے تمام لوازمات ٹرائی میں سے اٹھا کر ٹیبل پر رکھ دیئے اور سنیچہ کو کھانے کا اشارہ کر کے خود چائے بنانے میں لگ گئی۔

اور پھر ہر شام ان دونوں کی آمد مجھے ڈسٹرب کرنے لگی۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں ان کی حرکات و سکنات کو محسوس کرنے لگی تھی۔ ابتدائی چند دنوں کے بعد اب وہ میرے سامنے جھکتے

تھے۔ میں نے اس خوبصورت جوڑے کی آمد پر بے پناہ خوشی کا اظہار کیا تو سنیچہ فوراً ٹوکتی ہوئی بولی۔

”بس رہنے دو یہ منہ دیکھے کی محبت! ایک فون کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ تمہیں پتہ ہے میں سارا دن انتظار کرتی رہی۔“

”سوری میں امی کے ہاں چلی گئی تھی۔ کیونکہ تمہارے بنا گھر اتنا سونا سونا لگ رہا تھا کہ میں پریشان ہو گئی۔“ میں نے معذرت کرتے ہوئے بتایا تو وہ کہنے لگی۔

”مجھے بھی یہی خیال تھا کہ تم اکیلی ہو گی۔“ پھر ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ”پاپا کہاں ہیں؟“

”ابھی آفس سے نہیں لوٹے، تم بیٹھو ناں میں چائے کا کہہ کر آتی ہوں۔“

”جلدی کیا ہے پاپا کو آنے دو۔“ سنیچہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ بیٹھالیا تب میں نے خرم کو دیکھ کر پوچھا۔

”اور خرم کیسے ہو.....؟“

”اگر میں یہ کہوں کہ دعا ہے آپ کی تو آپ برا تو نہیں مانیں گی۔“ خرم نے قدرے شرارت سے کہا لیکن میں سمجھی نہیں۔

”اس میں برامانے کی کیا بات ہے؟“

”ہمارے ہاں یہ جواب بزرگوں کو دیا جاتا ہے۔“

”اچھا!“ میں ہنس پڑی۔ ”ٹھیک تو ہے۔ کیا میں تمہاری ساس نہیں ہوں؟“

”اس حساب سے تو مجھے آپ کو اماں یا آنٹی کہنا پڑے گا۔“ وہ غالباً مجھے چڑانا چاہ رہا تھا۔

”جو جی میں آئے کہو، میں بالکل برا نہیں مانوں گی۔“ میں نے کہا تو سنیچہ فوراً بول

پڑی۔

بھی نہیں تھے۔ ظاہر ہے رشتے میں میں ان کی کچھ بھی سہی عمر میں برابر تھی۔ اس لئے آفندی کی غیر موجودگی میں وہ میرا لحاظ نہیں کرتے تھے اور میں جو یہ سوچتی تھی کہ سنیعہ کے بغیر میرے دن کیسے کٹیں گے تو اب اس کے کینیڈا جانے کے دن شمار کرنے لگی تھی کیونکہ ان دونوں کی مشترکہ ہنسی نے میرے ہونٹوں کی مسکراہٹیں چھین لی تھیں۔ میں حیران ہو کر دیکھتی سنیعہ کا دن بدن نکھر تاروپ خرم کی والہانہ نظروں کے مرہون منت تھا۔ ایک پل کو وہ ادھر ادھر ہوتی تو وہ بے قرار ہو کر اس کے پیچھے لپکتا اور مجھے اپنے اندر تشنگی کا احساس ہونے لگتا۔ شاید میرے خوابوں کا طلسم دھیرے دھیرے ٹوٹ رہا تھا۔ میں سچ مچ خوفزدہ ہو گئی۔

اس روز وہ دونوں صبح ہی آگئے۔ سنیعہ نے آتے ہی میرے گلے میں بانیں ڈال دیں اور خوش ہو کر بتانے لگی کہ ان کی سٹینٹس کنفرم ہو گئی ہیں۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد ان کی روانگی ہے۔ ”تمہیں پتہ ہے ٹوٹی مجھے دنیا گھومنے کا کتنا شوق ہے اور خرم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اگلے سال چھٹی پر یہاں آنے کی بجائے وہ مجھے لندن لے جائے گا“ ہے نا خرم!“ سنیعہ نے مجھے بتاتے ہوئے پیچھے مڑ کر خرم کو مخاطب کیا تو وہ اس کی پیشانی پر آئی بالوں کی لٹ چھو کر بولا۔

”آف کورس!“

”اچھا تم لوگ بیٹھو تو ناشتا کر کے آئے ہو یا.....“

”کر چکے ہیں البتہ چائے پیس گے۔“

خرم نے خود کو صوفے پر گراتے ہوئے کہا تو میں کچن میں آ کر خود ہی چائے بنانے لگی۔ کیونکہ خاناماں سامان لینے گیا ہوا تھا اور ملازمہ جھاڑ پونچھ میں لگی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد سنیعہ بھی میرے پاس آکھڑی ہوئی اور رے میں کپ رکھتی ہوئی بولی۔

”رات میں کتنی دیر تک تمہارے بارے میں سوچتی رہی۔ ابھی تو میں یہاں ہوں جو روزانہ تمہارے پاس آ جاتی ہوں چلی جاؤں گی تو تم بہت اکیلی ہو جاؤ گی۔“

”ہوں.....“ میں نے ٹی پاٹ میں کھولتا ہوا پانی ڈالتے ہوئے بے دھیانی میں مختصر

”صبح اٹھتے ہی میں نے خرم سے کہا کہ آج ہم سارا دن تمہارے ساتھ گزراں گے۔“

”ہا..... ہاں اچھا کیا جو چلی آئیں۔“ جانے کیوں مجھے بولنے میں دقت ہوئی اور اس

بار وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

”کیا بات ہے تم کچھ سستی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

”ہاں ٹھیک ہے چلو یہ چائے لے جاؤ۔“ میں نے جلدی سے رے اٹھا کر اسے تھما

دی۔

”تم بھی آؤ ناں!“

”آ رہی ہوں ذرا خاناماں کو دیکھ لوں تم چلو۔“ میں اسے بھیج کر کچن کے پچھلے

دروازے سے باہر نکل آئی اور پیچ میں یونہی بے مقصد ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔

”وہ تمہاری ممی کہاں رہ گئیں، چائے نہیں پیس گی۔“

اندر سے خرم کی آواز آئی وہ سنیعہ سے پوچھ رہا تھا۔ لہجے میں شرارت تھی اس سے پہلے

کہ سنیعہ کوئی جواب دیتی، میں جلدی سے اندر آ گئی اور اپنا کپ اٹھا کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

”تم دونوں دوپہر کے کھانے میں کوئی خاص چیز کھانا چاہو تو بتاؤ۔“

”نہیں! کسی تکلف کی ضرورت نہیں بلکہ میرا تو خیال ہے کھانا ہم باہر کھائیں گے اور

آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں گی۔“ خرم نے کہا تو سنیعہ تائید کرتی ہوئی بولی۔

”بہت نیک خیال ہے۔ چلو ٹو بیہ آج ہم خوب گھومیں پھریں گے شاپنگ بھی کریں

گے۔“

”میں! میں تمہارے ساتھ.....!!“

”کیوں تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں جاسکتیں۔“ سنیعہ فوراً نوک کر بولی۔

”چلو اٹھو جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

مجھے 'میرا اندر مطمئن نہیں ہوتا تھا۔ میں جانتی ہوں کوئی بھی شخص مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوتا، پانے کے بعد بھی نہیں لیکن میں نے کیا پایا۔

”ہاں سوال یہ ہے کہ میں نے کیا پایا۔“ میرے اندر سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

”وہی جو میں نے چاہا۔“

میری کھلکھلاتی ہنسی کے جواب میں مبہم سی مسکراہٹ

”ایسا ہے تو.....!“

میری شوخیوں پر اچشتی نظر ڈال کر اپنے آپ سر ہلایا۔

”وہ کبھی اظہار نہ کرے تب بھی اس کے وجود سے صرف محبت کا احساس ہو۔“

اور میرے اندر دور تک سناٹا پھیل گیا جیسے چیرتی ہوئی بھابھی کی آواز۔

”وہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتا نہ محبت نہ اولاد.....“

”یہ ساری باتیں صرف سوچنے کی حد تک اچھی لگتی ہیں۔“

”لگتا ہے تم ابھی خوابوں کی دنیا سے نکلی نہیں ہو۔“

اور پتہ نہیں میں خوابوں کی دنیا سے نکلی تھی کہ نہیں اس وقت سنیعہ نے ضرور پکار کر مجھے کسی بھنور سے نکال لیا۔

”کہاں کھوئی ہو، میں کتنی دیر سے بلا رہی ہوں۔“

اس نے غالباً پہلے دور سے بلایا تھا اب قریب کھڑی جھنجھلا کر کہہ رہی تھی۔ میں نے گہری سانس ہونٹوں میں دبا کر اسے دیکھا تو پوچھنے لگی۔

”پانی میں نہیں چلو گی؟“

”نہیں! اب واپس چلو تمہارے پایا آگئے ہوں گے۔ خرم کو بلاؤ!“

میں کہتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں آئے تو خرم مجھے دیکھتے ہی

”لیکن اس وقت کہاں جائیں گے۔ شاپنگ سینٹر ز بھی گیارہ بارہ بجے سے پہلے نہیں کھلتے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر اطمینان سے چلیں گے۔“ میری بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“

”بس تو ابھی آرام سے بیٹھو۔ میں دیکھوں خانسا ماں پکانے کے لئے کیا لایا ہے۔“

میں ٹرے اٹھا کر کچن میں آگئی۔ خانسا ماں سودا لے آیا تھا۔ سنیعہ کو چکن بریانی بہت پسند تھی۔ میں نے خانسا ماں سے دہی بنانے کو کہا ساتھ میں کسٹرڈ۔ پھر اندر آئی تو سنیعہ وی سی آر پر کوئی مووی لگا رہی تھی اور آج کل کی موویز بھی ایسی ہوتی ہیں کم از کم میں ان دونوں کے ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لئے میں وہیں سے پلٹ کر اپنے بیڈروم میں آگئی پہلے اپنے کپڑے پر لیس کیے، پھر آفندی کو آفس فون کر کے دوپہر کا کھانا گھر آ کر کھانے کو کہا لیکن انھوں نے معذرت کر لی۔

جب تک سنیعہ اور خرم مووی دیکھتے رہے میں نے خود کو یونہی ادھر ادھر مصروف رکھا۔ پھر کھانے کے بعد میں نے بہت چاہا کہ کچھ دیر آرام کرنے کا بہانا کر کے سو جاؤں لیکن سنیعہ میرے سر پر سوار رہی جب تک میں ان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں ہو گئی۔

پھر پہلے ہم نے شاپنگ کی۔ اس کے بعد سی وی کی طرف نکل گئے۔ سنیعہ کہنا تھا کہ وہ ساحل پر میرے ساتھ پرانی یادیں تازہ کرے گی لیکن وہاں جا کر وہ مجھے بھول ہی گئی۔ یوں جیسے میں بھی ایک پرانی یاد ہو گئی ہوں۔ میں چپ چاپ دیکھتی رہی وہ خرم کا بازو تھا سہ پانی میں دور جا رہی تھی۔ پھر دونوں کی شوخیاں ایک دوسرے پر پانی اچھالنا بھاگنا اور میں جو اس سے زیادہ دیوانی تھی میرے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ عجیب سی بے کلی نے دل کا دامن تھام لیا تو میں ان دونوں پر سے نظریں ہٹا کر قصداً آفندی کو سوچنے لگی۔

میرے خوابوں سے نکل کر سچ مچ میری زندگی میں آنے والا شخص! جانے کیا کی تھی اس میں جو مجھے شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ میں لاکھ کہوں میرے خوابوں کو زندگی مل گئی اور کیا چاہیے

تھا۔ ”آپ خود کہہ دیں۔“

اس تمام عرصہ میں میں نے پہلی بار ان کی بات ماننے سے انکار کیا اور فوراً کروٹ بدل گئی تو مجھے اپنے پورے وجود پر ننھی ننھی چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ یہ یقیناً ان کی نظریں تھیں۔ پھر وہ کمرے سے نکل گئے اس کے بعد دوبارہ پتہ نہیں کب آئے کیونکہ میں تو بہت دیر تک جاگتی رہی تھی اور وہ میرے سونے کے بعد ہی آئے تھے۔

صبح جب میری آنکھ کھلی تو انہیں کارپٹ پر بکھری موتیے کی کلیاں چستے دیکھ کر مجھے حیرت کے ساتھ شرمندگی بھی ہوئی۔ فوراً اٹھتی ہوئی بولی۔

”آپ رہنے دیں آفندی میں سمیٹ لوں گی۔“

انہوں نے جیسے سنا ہی نہیں۔ ساری کلیاں سمیٹ کر کھڑے ہوئے اور میری طرف دیکھے بغیر بولے۔

”یہ تمہاری کلائیوں میں اچھے لگ رہے تھے۔“

”تھینک یو!“ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

سنیعہ خرم کے ساتھ کینیڈا چلی گئی تو میں جو ادھر اس کے جانے کے دن شمار کرنے لگی تھی پہلے واقعی مطمئن ہو گئی کہ اسے دیکھ کر دل میں انگڑائیاں لیتی بے نام سی آرزوؤں سے نجات مل گئی تھی۔

لیکن میرا اطمینان زیادہ دن کا نہیں تھا۔ بہت جلد میں پھر تنہائی کا شکار ہو گئی کیونکہ آفندی کی روٹین چینج ہوئی نہ رویہ۔

وہی صبح کے گئے شام میں اور اکثر شام کے بعد لوٹے۔ ان کا جو وقت میرے حصہ میں آتا اس میں وہ کچھ تھکے تھکے سے لگتے تھے۔ گو کہ کسی انداز سے بیزار ہی ظاہر نہیں ہوتی تھی لیکن حد درجہ غمناک تھا گفتگو میں نشست برخواست میں اور ہر ہر انداز میں۔

گئی۔

کچھ دیر بعد ملازمہ آفندی کے لئے چائے لے کر آئی تو میں اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ہاتھ سے کپ لے کر بیڈ روم میں آ گئی۔

آفندی ٹیبل پر کوئی فائل کھولے بیٹھے تھے۔ میری نظریں ان کے جھکے ہوئے سر سے ہوتی ہوئی ان کے ہاتھوں پر جا ٹھہریں بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں سلگتا ہوا سگریٹ دبا تھا اور دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں پین۔ یہ حقیقت ہے کہ اس شخص کا ہر انداز جداگانہ اور اثر کیٹو تھا۔ وہ میری طرف متوجہ نہ ہو تب بھی مجھے اپنی طرف متوجہ رکھتا تھا۔

میں نے سبک روی سے قریب جا کر چائے کا کپ ٹیبل پر رکھا تو انہوں نے فوراً سراونچا نہیں کیا اور میں نے محسوس کیا ان کی نظریں فائل سے ہٹ کر میرے ہاتھوں پر ٹھہر گئی ہیں میرا دل یکبارگی مچلنے لگا۔ جیسے خرم نے گجروں کی مہک اپنے اندر اتارنے کے بہانے سنیعہ کا ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگایا تھا۔

”تم کھڑی کیوں ہو بیٹھ جاؤ۔“

ان کے ٹوکنے پر جہاں میں چونکی وہاں مچلتا ہوا دل بجھ کر رہ گیا۔ کس قدر کٹھور پن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ کم از کم میرا دل رکھنے کی خاطر ہی میری نہ سہی گجروں کی تعریف کر دیں۔ میں دکھ سے سوچتی ہوئی اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گئی اور ایک ایک کلی نوچ کر پھینکنے لگی۔ انہوں نے دیکھا ضرور لیکن ٹوکا نہیں البتہ جب میں نے آنکھوں پر بازو رکھا تب فوراً پکار کر پوچھنے لگے۔

”ٹو بیہ سوری ہو کیا؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو اٹھتے ہوئے بولے۔

”چلو پہلے کھانا کھا لو پھر سونا۔“ میں نے آنکھوں پر سے بازو نہیں ہٹایا اور روٹھے لہجے

میں بولی۔

”مجھے بھوک نہیں ہے آپ کھالیں۔“

”تو جاؤ رئیس (خانساں) سے کہو کھانا لگا دے.....“ ان کا مقصد غالباً مجھے اٹھانا

اور یہی میرا آئیڈیل تھا پھر یہ نہیں کیوں کسی وقت میں پریشان ہو جاتی۔ میرا دل چاہتا انہیں جھنجھوڑ کر پوچھوں کہ انہیں کسی بات پر بے ساختہ ہنسی کیوں نہیں آتی یا غصہ کیوں نہیں آتا۔“

اس وقت وہ ٹی وی پر کوئی ڈاکومنٹری فلم بہت شوق سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے آکر چینل بدل دیا تو بجائے مجھے ٹوکنے کے اٹھ کر اپنے کمرے میں جانے لگے کہ فوراً احساس ہونے پر میں نے پکار لیا۔

”آفندی!“ انہوں نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں معذرت کرتی ہوئی بولی۔

”آئی ایم سوری میں نے خیال نہیں کیا۔“

”کس بات کا۔“ یہ نہیں سمجھے نہیں یا قصداً انجان بن گئے۔

”آپ یہ فلم دیکھ رہے تھے۔“ میں نے کہتے ہوئے دوبارہ چینل بدل کر وہی فلم لگا دی تو ایک نظر اسکرین پر ڈال کر بولے۔

”نیو مانیٹڈ تم جو دیکھنا چاہو!“

”میں یہی دیکھوں گی۔“ میں نے فوراً کہا تو ذرا سا مسکرائے اور آکر بیٹھے ہی تھے کہ جانے کیا ہوا۔ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے دوبارہ چینل بدل دیا اور بڑے آرام سے آکر ان کے پہلو میں بیٹھ گئی تو دھیرے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”تم شاید مجھے اپنے ساتھ چلانا چاہتی ہو۔ آئی ایم سوری تو یہ یہ بہت مشکل ہے۔“ میں حیران ہو کر دیکھنے لگی۔

”اس وقت جو تمہاری سوچیں اور شوق ہے اور جن موسموں کی تم اسیر ہو وہ سب میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں لیکن تم پر کوئی جبر نہیں، جودل چاہے کرو۔۔۔۔۔ اوکے!“ وہ میرا کندھا ہا کر اٹھ گئے اور ان کے پیچھے میں کتنی دیر تک گم صم بیٹھی رہ گئی تھی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ میں بجائے آفندی کی باتوں کو سمجھ کر کپڑے مائیز کرنے کے ان سے ضد باندھ بیٹھی جیسے انہوں نے کہا تھا کہ جودل چاہے کرو۔۔۔۔۔ اور میرا جودل نہیں چاہتا تھا وہ کرنے لگی۔ یعنی جہاں وہ گھر میں داخل ہوتے میں بلند آواز میں ڈیک لگا دیتی اور حقیقتاً میں نے ہندی فلموں کو کبھی پسند نہیں کیا اب خود پر جبر کرے وہی دیکھنے بیٹھ جاتی۔

بظاہر میری نظریں اسکرین پر ہوتیں لیکن سارا دھیان آفندی کی طرف ہوتا کہ کہیں تو وہ ٹوکیں گے اور انہوں نے جیسے قسم کھا رکھی تھی کسی انداز سے بھی ناگواری کا اظہار نہیں کرتے کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر گویا احسان کرتے پھر اٹھ کر بیڈروم میں چلے جاتے تو میں مزید جھنجھلا جاتی۔ صبح ناشتے کی ٹیبل پر وہ مسلسل اخبار دیکھنے میں لگے رہے۔ میری ہر بات کے جواب میں ہوں ہاں سے زیادہ کچھ نہیں کہا تب محض انہیں متوجہ کرنے کی خاطر میں نے چائے کا کپ اٹھاتے ہی قصداً ہاتھ سے چھوڑ دیا تو آواز پر اخبار رکھتے ہوئے بولے۔

”کیا ہوا؟“ پھر ٹیبل پر چائے گری دیکھ کر خود ہی سمجھ کر رئیس کو پکارا اور اس کے آنے پر کہنے لگے۔

”ٹیبل صاف کر دو اور بیگم صاحبہ کے لئے اور چائے لے آؤ۔“

”نہیں بس!“ میں اسی قدر کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور غصے کا اظہار زور سے کرسی دھکیل کر کیا۔ پھر پیر پختی ہوئی ڈائننگ روم سے نکل آئی۔ کچھ دیر بعد وہ آئے تو ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”میرا برف کیس کہاں ہے؟“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تو قریب آ کر پوچھنے لگے۔

”مجھ سے خفا ہو۔“

اور میرا دل چاہا میں ایک ہنگامہ کھڑا کر دوں۔ ان سے خوب لڑوں لیکن ان کی طرف دیکھتے ہی میرا غبار تھم گیا اور یہ نہیں مجھے غصہ کس بات پر تھا کم از کم ان پر نہیں ہو سکتا تھا، شاید میں

کر پوچھا۔

”جی فرمائیے!“

اس وقت نشست کا جوانداز تھا وہ آپ ہی آپ لہجے میں بھی سمٹ آیا اور شاید اسی انداز سے وہ خائف ہوا تھا لیکن تصدیق ہوتے ہی کہ یہ آفندی کا گھر ہے اس نے فوراً کندھے سے بیگ اتار کر فرش پر پھینکا پھر بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر بیٹھتا ہوا بولا۔

”پھر تو اپنا گھر ہے، بس آپ جلدی سے گرمائرم چائے پلوائیں، بڑی دور سے آ رہا ہوں اور راستے میں سردی بہت تھی۔“

”کھڑے ہو جائیں۔“ میں نے کہا تو ٹپٹا کر بولا۔

”جی!“

”فوراً کھڑے ہو جائیں۔“ میں نے سخت لہجے کے ساتھ پیشانی پر شکنیں ڈال لیں تو

اٹھتا ہوا بولا۔

”آپ شاید استانی ہیں!“

”سٹاپ۔“ اس نے فوراً ہونٹوں پر انگلی رکھ لی اور اپنے انداز سے ظاہر کرنے لگا جیسے کلاس روم میں کھڑا کیا گیا ہو۔

”ہاں! اب بتاؤ کون ہو، کہاں سے آئے ہو کس سے ملنا ہے اور بغیر اجازت اندر آنے پھر یہاں بیٹھنے کی جرات کیسے کی تم نے۔“ میرے اتنے سوالوں سے وہ چکرا گیا۔

”باپ رے آپ تو واقعی.....“

”فضول گوئی کی یہاں سختی سے ممانعت ہے۔ سیدھی طرح سے جواب دو۔“ میرے

ٹوکنے پر اس نے ذرا سے کندھے اچکائے، پھر روانی سے شروع ہو گیا۔

”میں کون ہوں؟ انسان! افق کے اس پار سے آ رہا ہوں۔ آفندی انگل سے ملنا ہے اور

بغیر اجازت یہاں آنے کا سوال اس سے پہلے تو کبھی کسی نے نہیں کہا آپ کون ہیں؟“ آخر میں

اپنے آپ سے خفا تھی۔

”کیا بات ہے کیوں اتنی کانٹنس ہو رہی ہو؟“

نرم دھیمالہجہ میں گہری سانس ہونٹوں کے اندر دبا کر الماری کی طرف بڑھ گئی اور ان کا بریف کیس نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا جسے لیتے ہوئے وہ میرا ہاتھ تھام کر بولے۔

”شاید تم اکیلے میں گھبرا جاتی ہو چلو تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔“

”میرے گھر.....“ میں جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بولی۔

”یہی میرا گھر ہے۔“

”آئی ایم سوری، آئی میں تمہاری مدد کے گھر۔“ انہوں نے فوراً معذرت کے ساتھ تسلی

کی۔

”نہیں مجھے کہیں نہیں جانا۔“

میرے انکار پر وہ کچھ دیر تک مجھ پر نظریں جمائے کھڑے رہے۔ پھر اسی خاموشی سے باہر نکل گئے تو میں اپنے آپ الجھنے لگی۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا ملازمہ کمرے کی صفائی کرنے آئی تو خواہ مخواہ اسے بھی ڈانٹ دیا، پھر آکر برآمدے میں بیٹھ گئی۔

سردیوں کے دن تھے، بلکی دھوپ اچھی لگ رہی تھی۔ سامنے ٹیبل پر ٹائلیں سیدھی کرتے ہوئے میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور ابھی آفندی کے ساتھ اپنے نامناسب رویے کو سوچ کر نادم ہونے جا رہی تھی کہ ٹیبل کی آواز پر میرا دھیان ادھر منتقل ہو گیا۔ ملازمہ بھاگتی ہوئی گیٹ پر جا رہی تھی۔ اور جب واپس پلٹی تو اس کے ساتھ جانے کون تھا بلیو جینز، بلیک جیکٹ کندھے پر سفری بیگ۔ میں نے ایک نظر میں اس کا جائزہ لے ڈالا۔

ملازمہ اسے میرے سامنے چھوڑ کر اندر چلی گئی اور مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ اپنی ٹانگیں سمیٹ کر نیچے کرلوں۔ نہ بولنے میں پہل کی، بس اپنی نظریں اس پر جمی رہنے دیں۔

”آداب! احسن آفندی صاحب کا گھر یہی ہے؟“ اس نے جانے کیوں کچھ خائف ہو

کھجاتا ہوا کن اکیوں سے مجھے دیکھ کر بولا تو اس کی ہٹ دھری پر سچ مچ میرا دماغ گھوم گیا۔

”تو جاؤ کسی ہوٹل میں بیٹھ کر اپنا نام یاد کرو، اس کے بعد بھی منہ اٹھائے یہاں مت چلے آنا آفندی سے تحریری اجازت نامہ لے کر آنا، ناؤ گیٹ لاسٹ!“ میں نے انتہائی تند و تیز لہجے میں آکر گیٹ کی طرف اشارہ کیا تو قدرے خاموشی کے بعد وہ ذرا سے کندھے اچکا کر بولا۔

”اس عزت افزائی کا شکریہ!“ پھر فوراً بڑھ کر اپنا بیگ اٹھایا اور گیٹ کی طرف چل

پڑا۔

اور میرا جوج سے موڈ خراب تھا اس شخص کی وجہ سے مزید دماغ خراب ہو گیا۔ اندر آ کر کتنی دیر تک تلملاتی رہی۔ چیزیں اٹھا اٹھا کر پختی اس پر بھی غصہ کم نہیں ہوا تو آفندی کے آفس فون کر ڈالا اور بجائے صورت حال بتانے کے چھوٹے ہی بولی۔

”آفندی میں اپنے گھر جا رہی ہوں۔“ دوسری طرف انہوں نے سوچتے ہوئے انداز

میں پوچھا۔

”اس وقت کہاں ہو؟“

”میں.....؟“ میں ٹپٹا گئی۔ میں ابھی صبح ہی تو کہہ رہی تھی کہ یہی میرا گھر ہے۔ ادھر وہ منتظر تھے اور مجھے کوئی جواب نہیں سوچ رہا تھا۔ ”پتہ نہیں“ کہہ کر فون بند کر دیا۔ پھر اچانک جوائی کے گھر جانے کا ارادہ کیا تھا اسے ترک کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

شام تک میں کافی فریض تھی۔ بس صرف صبح آفندی کے ساتھ اپنے نامناسب رویے کا خیال تھا حالانکہ وہ تو مجھے کبھی احساس نہیں دلاتے تھے کہ میں نے کچھ غلط کیا اور شاید اسی وجہ سے میں خود اپنے آپ شرمندہ ہو جاتی۔

بہر حال اس وقت میں ان کا فیورٹ کلر پہن کر لاؤنج میں آ بیٹھی۔ میرا پروگرام ان کے ساتھ آؤنٹنگ پر جانے کا تھا۔ کسی کسی دن میں خود ہی ایسے پروگرام بنالیتی تھی اور انہوں نے کبھی منع نہیں کیا تھا۔ ان کا مخصوص جملہ تھا۔

اس نے اچانک میری آنکھوں میں دیکھ کر پوچھا۔

”بیگم آفندی؟“ میں نے کہا تو خوشگوار حیرت میں گھر کر بولا۔

”واؤ یہ خبر تو ملی تھی کہ آفندی انکل نے شادی کر لی لیکن.....“

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ پھر بھی شریری مسکراہٹ چہرے پر چمک رہی تھی۔ ٹپٹا کر اور کچھ نہیں سوچا تو اپنی ٹانگیں سمیٹ کر پیروں میں چپلیں ڈالنے کے بہانے نیچے جھک گئی پھر سیدھی ہو بیٹھی تو قصداً سرسری انداز اختیار کیا۔

”ہاں! نام بتایا ہے تم نے اپنا۔؟“

”نام کہاں بتایا ہے میں نے اور جب تک آپ چائے نہیں پلوائیں گی بتاؤں گا بھی

نہیں۔“

”مجھے تمہارا نام جاننے سے کوئی دلچسپی نہیں اور اب تم جا سکتے ہو۔“ میں نے چڑ کر کہا تو

وہ احتجاجاً چیخ پڑا۔

”ارے کمال کرتی ہیں آپ اتنی دور سے آ رہا ہوں۔“

”میں کچھ نہیں جانتی۔ آفندی آفس جا چکے ہیں شام میں آئیں گے۔ تم بھی اسی وقت آنا یا چاہو تو ان کے آفس میں جا کر مل لو۔“ میں حتمی انداز میں کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور اندر جانے لگی کہ وہ ایک ہی جست میں میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”کیا واقعی چلا جاؤں!“

”بالکل میں کسی اجنبی کو اتنی دیر تک اپنے گھر ٹھہرنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔“

”میں اجنبی نہیں ہوں۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”ٹھیک ہے اپنا نام بتاؤ! میں پہلے آفندی کو فون کر کے تمہارے بارے میں معلوم کرتی

ہوں۔“

”وہ ایسا ہے کہ میں جب تک چائے نہیں پیوں گا مجھے اپنا نام نہیں یاد آئے گا۔“ وہ سر

”او کے میں شاور لے لوں پھر چلتے ہیں۔“

اس وقت خانساں کو رات کھانا بنانے سے منع کر کے میں نے چھٹی دے دی۔ کیونکہ باہر جانا تھا تو کھانا بھی وہیں کھا لیتے۔ چھ بج رہے تھے آفندی آئے، ان کے ساتھ صبح والے شخص کو دیکھ کر میری پیشانی آپ ہی آپ شکن آلود ہو گئی لیکن اس وقت میں اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اسے یکسر نظر انداز کر کے میں نے آفندی کو سلام کیا اور ان کے ہاتھ سے بریف کیس لیتے ہوئے فوراً اپنا پروگرام بتا دیا۔

”آفندی ابھی ہم آؤنگ پر چلیں گے۔“

”ہوں!“ مخصوص جملے کی بجائے بند ہونٹوں کے اندر انہوں نے ہوں کی آواز نکالی پھر اس کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

”یہ سالار ہے غالباً صبح یہاں آیا تھا۔“ میں نے یونہی اس کی طرف دیکھا تو شریر مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”آداب!“ میں نے اسے جواب دینے کی بجائے آفندی سے پوچھا۔

”کون ہے یہ؟“

”ابھی انکل نے بتایا تو ہے میں سالار ہوں۔“ آفندی سے پہلے وہ بول پڑا۔

”میں نے تم سے تمہارا نام نہیں پوچھا۔“ میں نے تیکھی نظروں سے اسے دیکھا تو

کندھے اچکا کر بولا۔

”کمال ہے اسی نام کے چکر میں تو صبح آپ نے مجھے نکال باہر کیا۔“

”سالار.....!“ آفندی سرزنش کرتے انداز میں بولے۔ ”اپنے کمرے میں آ جاؤ۔“

”یس سر!“ نہایت سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے فوراً اپنا بیگ اٹھایا

اور جس اعتماد سے ایک کمرے کی طرف بڑھا اس سے میں سمجھ گئی کہ وہ پہلی بار یہاں نہیں آیا بلکہ

اس گھر سے اس کا قریبی تعلق ہے۔

”آفندی چلیں ناں کہیں باہر چلتے ہیں۔“ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تب میں نے آفندی کو مخاطب کر کے کہا اور میرا خیال تھا شاید وہ اس کی وجہ سے منع کر دیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔

”او کے میں شاور لے لوں جب تک تم رئیس سے کہو سالار کے کھانے وغیرہ کا خیال رکھے۔“

”رئیس کو تو میں نے چھٹی دے دی۔“ میں نے کہا تو وہ جو اپنی بات کے اختتام پر آگے بڑھ رہے تھے پلٹ کر مجھے دیکھنے لگے۔

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کے ساتھ کوئی مہمان بھی آنے والا ہے اگر آپ فون کر دیتے تو میں.....“

”نو پر اہلم۔“ وہ کہتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں جانتی تھی انہیں شاور لینے میں دس منٹ سے بھی کم وقت لگے گا۔ اس لئے بیٹھنے کی بجائے میں شہلتی ہوئی برآمدے میں نکل آئی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ گھر آئے مہمان کو اس طرح چھوڑ کر جانا غیر اخلاقی فعل ہے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم چائے کے ساتھ کچھ لوازمات ہی اس کے کمرے میں پہنچا دوں۔ باقی رات کا کھانا جہاں ہم کھائیں گے وہیں سے اس کے لئے بھی لیتے آئیں گے۔

اپنی اس سوچ پر عمل کے ارادے سے میں دوبارہ اندر آئی تو آفندی اس کے کمرے سے نکلتے نظر آئے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

”چلو۔“

”اور وہ آئی مین سالار کے لئے چائے وغیرہ.....؟“

”وہ خود بنا لے گا۔“ انہوں نے اطمینان سے کہا تب میں ان کے ساتھ باہر نکل آئی۔

ایک بار آفندی نے کہا تھا کہ شاید میں انہیں اپنے ساتھ چلانا چاہتی ہوں حالانکہ ایسا

قدرے توقف کے بعد پھر کہنے لگے۔

”سالار کی والدہ میری منہ بولی بہن ہیں۔ گیلانی کی زندگی میں ہمارے مابین یہ رشتہ قائم ہوا تھا اور گیلانی کے بعد اگر میں نے ان کی ذمہ داری قبول کی تو یہ میرا فرض تھا۔ میں نے اور سنیچہ کی ماں نے بھی بہت چاہا کہ وہ سالار کو لے کر ہمارے پاس آ جائیں لیکن وہ اپنا گھر چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئیں، دوسری شادی بھی نہیں کی۔

جب تک سنیچہ کی ممتاحیں، ہم دونوں سال میں ایک دو بار ان کے پاس ہو آتے تھے پھر میں خود حالات کے چکر میں پھنس گیا۔ سنیچہ کی ماما کی ڈیوٹی تھی۔ اس وقت سنیچہ اتنی چھوٹی تھی کہ میں نہ اسے کہیں لے جا سکتا تھا نہ چھوڑ سکتا تھا بس گھر اور دفتر کا ہو کر رہ گیا۔ اس کے باوجود سالار اور اس کی والدہ کی جو ذمہ داری میں نے قبول کی تھی اس سے کبھی غافل نہیں ہوا تھا۔

یہ ساری باتیں میں تمہیں اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم جان لو کہ یہ ماں بیٹا شروع ہی سے میری زندگی میں شامل ہیں۔ انہیں تم نے اجنبی اور غیر سمجھ کر اگنور نہیں کرنا۔ سالار مجھے کسی طرح بھی سنیچہ سے کم عزیز نہیں ہے۔ تھوڑا شوخ اور شرارتی ہے اور اس عمر میں تو سب ہی ایسے ہوتے ہیں۔

تمہیں اگر اس سے کوئی شکایت ہو تو مجھ سے کہنا، اسے مت ٹوکنا۔ بظاہر جتنا کھانا را نظر آتا ہے اندر سے اتنا ہی حساس ہے اور ایسے لوگ کبھی اچانک ٹوٹ کر یوں بکھرتے ہیں کہ پھر سمیٹے نہیں جاتے۔ میری بات سمجھ رہی ہوناں!“

میں جو بہت خاموشی سے اور جیسے سانس روکے انہیں سن رہی تھی۔ آخر میں ان کے پوچھنے پر پہلے میرے سینے میں رکی سانس ہونٹوں کی قید سے آزاد ہوئی، پھر اثبات میں سر ہلایا تو کہنے لگے۔

”صبح اگر سالار نے تم سے کوئی بدتمیزی کی ہے تو اس کے لئے میں تم سے.....“

”نہیں!“ میں فوراً بول پڑی۔ ”اس نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔“

نہیں ہے بلکہ میں خود ان کے ساتھ چلتے ہوئے فخر محسوس کرتی ہوں کیونکہ ان کے ساتھ مجھے اپنا آپ بہت معتبر لگتا ہے۔ ان کی شخصیت ان کے وجود سے ملنے والا غیر معمولی تحفظ کا احساس باقی سارے احساسات پر حاوی ہو جاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے باقی احساسات مر گئے۔ وہ بھی زندہ ہیں، جب ہی تو کبھی کبھی میں پریشان ہو جاتی ہوں، اپنے آپ جھنجھلا جاتی ہوں اور یہ بالکل فطری سی بات ہے۔ میری عمر کے تقاضے ہیں یہ کہ

کبھی بے بات بننا!

کبھی بے سبب رونا!

کبھی کوئی روٹھے تو میں ہاتھ جوڑ کر بنتی کروں!

کبھی میں خود روٹھ جاؤں!

اور جب آفندی کی گیمبھرتا میرے ان تقاضوں کے سامنے چپکے سے بند باندھ دیتی ہے تب ظاہر ہے میں جھنجھلا جاتی ہوں۔ میرے اندر کی لہریں سرکشی پر آمادہ ہو کر مجھے اکساتی ہیں اور میں ہر کام ان کے مزاج کے خلاف کرنے لگتی ہوں شاید میرا مقصد انہیں اشتعال دلانا نہیں ہوتا ہے لیکن وہ مشتعل نہیں ہوتے، یہ نہیں یہ ان کی خوبی ہے یا خامی میں ابھی تک سمجھ نہیں پائی۔

ابھی بھی کس طرح گھر آئے مہمان کو چھوڑ کر میرے ساتھ چلے آئے ہیں۔ میں نے ٹیبل کی شفاف سطح پر دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بغور انہیں دیکھا، وہ ہمیشہ کی طرح پرسکون نظر آ رہے تھے۔ مینو پر نشان لگا کر ویڑ کو تھما یا پھر میری طرف متوجہ ہوئے تو کہنے لگے۔

”سالار میرے بہت عزیز دوست کا بیٹا ہے گو کہ میرے دوست گیلانی اس دنیا میں نہیں ہیں، ان کے انتقال کو بہت سال ہو گئے ہیں۔ اس وقت سالار دو سال کا تھا اور جیسا دنیا کا دستور ہے چار دن ہمدردی کے بعد سب بھول جاتے ہیں تو یہ ماں بیٹا بھی بالکل تنہا رہ گئے تھے بے یار و مدگار۔ اور میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں نے انہیں سہارا دیا البتہ میں کبھی ان سے غافل نہیں

ہوا۔“

پھر جب میں اپنے لئے چائے بنا کر دوبارہ لاؤنج میں آئی تو آفندی سونے کے لئے جا چکے تھے۔ میں نے ٹی وی اسکرین پر عابدہ پروین کو دیکھا تو شوق سے بیٹھ کر سننے لگی۔

جب سے تو نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے
سنگ ہر شخص نے ہاتھوں میں اٹھا رکھا ہے
مجھے یہ غزل بہت پسند تھی۔ پھر عابدہ پروین کی کمال کی گائیکی نے سچ مچ اس میں جان ڈال دی تھی۔

پتھر! آج میرے سر پہ برستے کیوں ہو
میں نے تم کو بھی کبھی اپنا خدا رکھا ہے
پی جا ایام کی تلخی کو بھی ہنس کر ناصر
غم کو سہنے میں بھی قدرت نے مزہ رکھا ہے
جب سے تو نے مجھے.....

چائے کا کپ خالی کر کے میں نے ایک طرف رکھا اور آخر میں خود بھی ساتھ ساتھ گنٹانے لگی۔ اس کے بعد دوسری غزل پھر گیت میں شوق سے سنتی رہی اور جب پروگرام کا اختتام ہوا، گھڑی کی سوئیاں ساڑھے بارہ بج رہی تھیں میں نے اٹھ کر ٹی وی بند کر دیا۔ پھر لائٹ آف کرنے کے ارادے سے سوئچ بورڈ کی طرف بڑھی تھی کہ سالار اپنے کمرے سے نکل کر آگیا۔ میں نے رک کر پوچھا۔

”کیا تمہیں نیند میں چلنے کی عادت ہے یا بیماری ہے۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر مسکرا کر نفی میں سر ہلایا تو میں لائٹ آف کرنے کا خیال

چھوڑ کر صوفے کے پاس آکھڑی ہوئی اور پوچھا۔

”کچھ چاہئے؟“

”ہاں اگر کچھ ہے تو.....؟“

”پھر تم نے اسے گھر سے کیوں نکالا؟“

”اس لئے کہ میں پہلے سے اسے نہیں جانتی تھی اور میرے بہت پوچھنے پر بھی اس نے نہ اپنا نام بتایا نہ یہ کہ کہاں سے آیا ہے۔“ میں نے صاف گوئی سے بتا کر پوچھا۔

”اور اس نے آپ سے کیا کہا ہے۔“

”وہ خاصا شرمندہ تھا کہہ رہا تھا اس سے کچھ بدتمیزی ہو گئی ہے جس کی بناء پر تم نے اسے گھر سے نکال دیا اور میں نے اسی وقت اسے تنبیہ کر دی تھی، بہر حال کھانا کھاؤ۔“

آخر میں انہوں نے کھانے کی طرف اشارہ کر کے خود ہی اس موضوع کو ختم کر دیا۔

اور واپسی میں ہمارا موضوع سنیعہ تھی۔ ابھی دو روز پہلے اس کا تفصیلی خط آیا تھا شاید بہت فراغت سے بیٹھ کر اس نے لکھا تھا۔ اتنی ڈھیر ساری باتیں جانے کہاں کہاں گھومنے گئے تھے دونوں وہ بہت خوش تھی۔ اس کے خط کی ہر ہر سطر سے اس کی خوشی چھلکتی نظر آتی تھی۔ جو حقیقتاً آفندی نے بھی محسوس کی۔ جب ہی اب اس کی طرف سے اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔

جب ہم گھر پہنچے، دس بج رہے تھے اور میں کیونکہ پوری دوپہر سوتی رہی تھی (ویسے بھی یہ میرا معمول تھا) اس لیے اب اتنی جلدی سونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ بلکی آواز میں ٹی وی آن کر کے میں نے آفندی سے چائے کا پوچھا تو وہ منع کرتے ہوئے سالار کے کمرے میں چلے گئے۔ پھر فوراً واپس آتے ہوئے بولے۔

”سالار سو رہا ہے پتہ نہیں اس نے کھانا بھی کھایا ہے کہ نہیں۔“

”ارے اس کے لئے کھانا تو ہم لائے نہیں۔“ میں نے اپنی یادداشت پر افسوس کا

اظہار کیا۔

”خیر اب تو وہ سو چکا ہے اور اگر اجازت دو تو میں بھی کچھ دیر سولوں۔“ آخری الفاظ

انہوں نے دلفریب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ادا کئے۔ سونے کے ساتھ ”کچھ دیر“ ان کا مخصوص

اشارہ تھا میں نے اپنی شرگیں مسکراہٹ ہونٹوں میں چھپا کر فوراً کچن کا رخ کیا۔

سالار کے آنے سے اس گھر کی فضا ویسی ہو گئی جیسی سنیچہ کی شادی سے پہلے تھی۔ چند
 دنوں میں میری اس کے ساتھ اچھی خاصی دوستی ہو گئی اس لئے وہ جب میس جا کر رہنے کی بات کرتا
 میں اس کی شدید مخالفت کرتی اور آفندی نے تو پہلے دن ہی اس سے کہہ دیا تھا کہ اپنا گھر ہوتے
 ہوئے اسے میس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

گو کہ وہ سارا دن گھر پر نہیں رہتا تھا لیکن آفندی کی طرح بہت مصروف بھی نہیں تھا۔ صبح
 نکلتا تو سہ پہر تک واپس آ جاتا اور آتے ہی وہ اپنے کمرے میں چلا جاتا۔

پھر بھی اس کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ کبھی رئیس کو پکار کر چائے کا کہتا اور کبھی
 ملازمدار کی شامت آتی جو صفائی کے دوران اس کی چیزیں ادھر ادھر کر دیتی تھی۔ یعنی گھر میں زندگی
 کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ مجھے دوپہر میں سونے کی عادت ہو گئی تھی جسے میں نے ترک نہیں کیا
 البتہ پہلے اطمینان سے شام میں اٹھتی تھی اب وہ پانچ بجے اونچی آواز میں ڈیک لگا دیتا جس سے
 میری آنکھ کھل جاتی۔

شروع کے چند دن میں بہت جھنجھلائی لیکن اس نے مجھے قائل کر لیا۔

”زیادہ سونے سے عمر گھٹتی ہے۔ دو سے پانچ بجے تک گھٹنے بہت ہیں۔ ضرورت
 سے زیادہ نیند انسان کو ناکارہ بنا دیتی ہے آپ آما کر دیکھیں پانچ بجے اٹھ کر فریش ہوتی ہیں یا وہ
 جو شام ڈھلے اٹھتی ہیں۔“

اور میں نے آزمایا، پانچ بجے میں بہت فریش ہوتی تھی۔ پھر رات میں بھی بہت دیر
 تک کروٹیں نہیں بدلتی پڑتی تھیں۔

اس وقت میں سو کر ابھی تو شاور لینے کے بعد کمرے سے نکل کر آئی وہ لان کی طرف
 کھلنے والی کھڑکی کے پاس کھڑا جانے کیا سوچ رہا تھا۔ مجھے شرارت سوچھی اونچی آواز میں گانا
 شروع کر دیا۔

میرے سامنے والی کھڑکی میں

اک

چاند

کا

کھڑا

رہتا

بے

اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھا اور مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا کر جوابی جملہ کہا۔

”لیکن مجھے تو کھڑکی کے اندر نظر آ رہا ہے۔“

”فوراََ نظر ٹیٹ کر آؤ۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو اس نے کمال ایکٹنگ کی۔ یکسر

انجان بن کر پہلے ادھر ادھر دیکھا پھر اپنی طرف اشارہ کرتا ہوا حیرت سے پوچھنے لگا۔

”مجھ سے کہہ رہی ہیں؟“

”اور کون ہیں یہاں۔“

”میں سمجھا آپ آفندی انکل سے مخاطب ہیں۔“ میں اس کا مطلب سمجھ کر چیخ پڑی۔

”خبردار! جو آفندی کے بارے میں کچھ التماسیدھا کہا تو۔“

”توبہ کریں! میں ہرگز بزرگوں کی شان میں گستاخی نہیں کر سکتا۔“

وہ فوراً کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا مسکین سی شکل بنا کر بولا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں

شرارت ناچ رہی تھی یعنی وہ آفندی کو بوڑھا کہہ رہا تھا۔ حقیقتاً میں اندر ہی اندر تلملا گئی۔ لیکن اس پر

ظاہر نہیں کیا۔ بڑے آرام سے بولی۔

”شباباش! اچھے بچے بزرگوں کی عزت کرتے ہیں۔“

”میں بچہ نہیں ہوں۔“ اس کے فوراً احتجاج پر میں بے ساختہ زور سے ہنسی اور پھر رات

چڑانے کی خاطر ہنستی چلی گئی۔ تبھی آفندی آگئے وہی ان کا اپنا انداز مجھ پر ایک نظر ڈالنے کے بعد

اسے دیکھنے لگے۔ وہ جھل سا کھڑا تھا سر کھجاتا ہوا بولا۔

”سر یہ میرا مذاق اڑا رہی ہیں۔“

”پہل اس نے کی تھی آفندی یہ میرا بلکہ.....“ آپ کا “کنہے سے پہلے میں نے نچا!

ہونٹ دانتوں میں دبایا اور فوراً سنبھل کر بولی۔

”پہل اس نے میرا مذاق اڑایا تھا۔“

”شام میں آئیں گے؟“

”نہیں میں نے منع کر دیا ہے۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ میرا آپ سب کے ساتھ رہنے کو دل چاہ رہا تھا لیکن اگر آپ ایسے ہی سوال جواب کرتی رہیں تو میں آج ہی واپس چلی جاؤں گی۔“ میں نے ہنس کر کچھ روٹھ کر کہا تو امی غالباً سمجھ کر ٹوکتی ہوئی بولیں۔

”ہیں! یہ کیا کہہ رہی ہو! جب تک دل چاہے رہو۔“

اور شادی کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ میں تین دن امی کے گھر رہی ورنہ صبح آتی شام میں چلی جاتی اور اکثر شام میں ہی آفندی کے ساتھ کچھ دیر کے لئے۔

اور سچ تو یہ ہے میرا بالکل دل نہیں لگا۔ حالانکہ بھیا کے دونوں بچے حنا اور نومی سارا وقت میرے ساتھ لگے رہے۔ ان کی شرارتیں معصوم باتیں، ہلکھلائی ہنسی کے ساتھ میں خود بھی ہنستی رہی لیکن میرا دھیان مسلسل آفندی کی طرف رہا۔ گوکہ اب وہ اکیلے نہیں تھے ان کے ساتھ سالار بھی تھا، پھر بھی مجھے لگا جیسے میں انہیں تنہا چھوڑ آئی ہوں۔ اور مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

تیسرے دن میں صبح ہی اپنے گھر جانے کے لئے تیار ہو گئی لیکن امی نے زبردستی شام تک روک لیا۔ ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا کہ جب آفندی سے تین دن کا کبہ آئی ہو تو اصولاً آج شام میں انہیں خود آنا چاہیے۔ گوکہ میں ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دیتی اور شاید آفندی بھی۔ پھر بھی دنیا داری تو نبھانی پڑتی ہے۔

دوپہر میں میں نے سوچا آفندی کو آفس فون کر کے شام میں آنے کے لئے کہہ دوں کیونکہ ان کے ساتھ میں نے کچھ طے نہیں کیا تھا لیکن پھر اچانک کسی خیال کے تحت میں نے انہیں فون کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ آیا انہیں کتنا خیال ہے اور ان کی آزمائش کے چکر میں میں خود پریشان ہو گئی۔ دل کو دھڑکا لگ گیا کہ اگر وہ نہیں آئے تو! اور ان لمحوں میں مجھ

”دونوں نے ایک دوسرے کا مذاق اڑا لیا حساب برابر ہو گیا پھر اب جھگڑا کس بات کا

ہے۔“

آفندی نے بریف کیس مجھے تھماتے ہوئے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے تو ایک پل کو میں اپنی جگہ سن ہو گئی۔ پھر فوراً ان کے پیچھے چل پڑی، شاید کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔

گوکہ آفندی نے اپنے کسی انداز سے ظاہر نہیں کیا لیکن مجھے خود احساس ہو رہا تھا رات تک ان کے آس پاس منڈلاتی رہی۔ اور جب صبح وہ آفس جانے لگے تب میں بھی ان کے ساتھ تیار ہو گئی۔

”آفندی مجھے امی کے گھر چھوڑ دیں۔“ ایک لمحہ کو ان کی آنکھوں میں تیر سہایا لیکن کچھ بولے نہیں خاموشی سے چل پڑے اور جب مجھے امی کے گھر اتار تب پوچھنے لگے۔

”تمہاری واپسی کیسے ہو گئی آئی مین خود سے چلی جاؤ گی یا شام میں آؤں؟“

”شام میں نہیں اگر آپ اجازت دیں تو میں دو تین دن یہاں رہ جاؤں۔“ میں نے کہا تو کچھ دیر تک میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

”ایز یو انک!“ اس کے ساتھ ہی گاڑی بڑھالے گئے اور میں اندر آ گئی۔

امی اور بھابھی کے وہی سوال تھے۔

”اکیلی آئی ہو آفندی اندر کیوں نہیں آئے وغیرہ وغیرہ۔“

پتہ نہیں شادی کے بعد لڑکی کے بارے میں یہ کیوں سوچ لیا جاتا ہے کہ اب وہ میاں کے بغیر ایک قد نہیں چل سکتی۔ خواہ مخواہ کی تشویش۔ میاں ساتھ ہو تو ٹھیک ورنہ پہلا خیال یہی کہ کہیں اس نے نکال تو نہیں دیا۔

”آفندی کو آفس سے دیر ہو رہی تھی اس لئے وہ باہر سے چلے گئے۔“ یہ ہی سچ تھا پھر

بھی بھابھی کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”حنا! جاؤ گیٹ کھولو تمہارے انکل آئے ہیں۔“ حنا تخت پوش سے اتر کر بھاگتی ہوئی گئی اور گیٹ کھولنے لگی تو میں قصداً ادھر سے نظریں ہٹا کر کچھ انجان سی بن گئی۔ جب آفندی نے قریب آ کر سلام کیا تب میں نے انہیں دیکھا تو فوراً پوچھنے لگے۔

”کیا پروگرام ہے؟“

”آپ پہلے بیٹھیں تو۔“ مجھ سے پہلے بھا بھی بول پڑیں اور اٹھ کر ان کے لئے کرسی کھینچ کر سامنے کی تو وہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

”تھینک یو!“ پھر مجھے یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں، ”چلیں“ اور میں نومی کو گود سے اتار کر اٹھ کھڑی ہوئی تو بھا بھی جانے کیا تبھیں کہنے لگیں۔

”ارے نہیں تم بیٹھو چائے میں لے کر آتی ہوں۔“

”نہیں بھا بھی پلیز رہنے دیں۔“ آفندی نے منع کیا لیکن بھا بھی چلی گئیں۔

پھر چائے کے دوران بھا بھی آفس سے آگئے اور امی نماز سے فارغ ہو کر آ کر بیٹھیں تو انہوں نے رات کے کھانے تک رکنے پر بہت اصرار کیا لیکن آفندی سہولت سے معذرت کرتے رہے۔ چائے کے بعد کچھ دیر بیٹھے۔ پھر مجھے چلنے کا اشارہ کیا تو میں امی سے اجازت لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میرا خیال تھا آپ مجھے بھول گئے ہوں گے۔“ میں شام سے جن اندیشوں میں گھری تھی، غالباً انہی کے پیش نظر گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے ان سے پہلی بات یہی کی تو وہ حیران ہو کر بولے۔

”یہ خیال کیوں کر آیا تمہیں۔“

”پتہ نہیں لیکن آیا ضرور!“ میرے سیدھے سادے انداز پر وہ ذرا سا مسکرائے پھر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

”کوئی اپنی چیز کو بھی بھولتا ہے۔“ اور میرے اندر باہر یہاں وہاں ہر طرف دھنک

پر ادراک ہوا کہ میں ان سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ محبت ہی میں تو اندیشے اور وسوسے جنم لیتے ہیں۔ اور جانے کیسے اندیشوں میں گھری سرشام ہی حنا اور نومی کے ساتھ برآمدے میں آ بیٹھی۔ اور جب میں نے انہیں بتایا کہ آج میں اپنے گھر جا رہی ہوں تو دونوں میری منتیں کرنے لگے۔

”آج نہیں جائیں پھوپھو۔“

”بیٹا وہاں آپ کے انکل اکیلے ہیں میں پھر آؤں گی۔“ میں نے پیار سے دونوں کے گال چھو کر کہا تب ہی بھا بھی آگئیں مجھے بچوں کے ساتھ دیکھ کر کہنے لگیں۔

”تمہارے آنگن میں بھی اب پھول کھلنے چاہئیں ثوبی! کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہاری شادی کو۔“

”کوئی اتنا زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔“ میں نے ٹالنے کی غرض سے یونہی کہہ دیا تو بھا بھی میرے پاس بیٹھتی ہوئی سنجیدگی سے بولیں۔

”لا پرواہی سے بات مت اڑایا کرو۔ اس معاملے میں لا پرواہی کر کے تم سراسر اپنا نقصان کرو گی۔ کیا تمہیں بچے اچھے نہیں لگتے۔“

”بچے کسے اچھے نہیں لگتے؟“ میں نے بے اختیار نومی کو اٹھا کر اپنی گود میں بیٹھالیا تو بھا بھی کچھ دیر تک خاموشی سے مجھے دیکھتی رہیں پھر کہنے لگیں۔

”ایسا مت کرو آج کل میں تمہیں اپنی گانٹی کے پاس لے چلوں گی۔“

میں کچھ نہیں بولی اور اس سے پہلے کہ بھا بھی مزید کچھ کہتیں۔ نومی کو گدگدا کر ہنسانے لگی۔ بھا بھی سمجھ گئیں میں ان کی بات ٹال رہی ہوں۔ قدرے توقف سے پوچھنے لگیں۔

”سنیچہ کے خط وغیرہ آتے ہیں؟“

”ہوں“ فون بھی کرتی ہے۔“ میں نے نومی کے ساتھ مصروف رہ کر جواب دیا۔ اسی وقت باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی تو میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا، اور میں گیٹ کی طرف دیکھتی ہوئی حنا سے بولی۔

تھا۔ اور ابھی تک کسی شکایت کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ میں جو کہتی بڑے آرام سے مان لیتا بالکل کسی سعادت مند بچے کی طرح، لیکن کسی وقت یوں ہوتا کہ وہ اچانک مجھ پر حاوی ہو جاتا اور ایسے ہی لمحوں میں، میں پریشان ہو جاتی تو بھاگ کر آفندی کی پناہوں میں چھپنے کی کوشش کرتی۔ بڑی مضبوط پناہ گاہ تھی غیر معمولی تحفظ کا احساس بخشی ہوئی لیکن اس پناہ گاہ میں آنے سے پہلے بہت سی آرزوؤں کو بھینٹ چڑھانا پڑتا تھا، اس کا احساس مجھے ایک بار پہلے خرم کی آمد سے ہوا تھا اور اب سالار..... آج شام میں ہی کیسے بظاہر سرسری انداز میں پوچھ رہا تھا۔

”آپ کی شادی آپ کی مرضی سے ہوئی یا گھر والوں نے زبردستی کی تھی۔“

”سراسر میری مرضی سے۔“ میں فوراً بولی تھی۔

”واقعی کیا آپ کو اپنی پسندنا پسند بنانے کا اختیار حاصل تھا۔“ وہ بے حد حیران ہوا اور میں سمجھی نہیں جب ہی گردن اکڑا کر بولی تھی۔

”جناب میری فیملی کوئی اتنی بیک ورڈ نہیں ہے۔“

”پھر آپ نے اس شادی پر اعتراض کیوں نہیں کیا۔“ اس کے الجھنے پر میں سمجھی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے تب پہلے ذرا سانس لی اس کے بعد کہا تھا۔

”تم یہ کہنا چاہتے ہو ناں کہ آفندی مجھ سے بہت بڑے ہیں تو ایسا ہے کہ مجھے ہمیشہ سے میچور لوگ پسند رہے ہیں اس لیے جب شادی کی بات آئی تو میں نے تمہارے جیسوں کو چھوڑ کر آفندی کا انتخاب کیا۔“

ایسے موقعوں پر جب وہ کچھ جتنا چاہتا تھا تو میں بدلہ ضرور لیتی تھی جیسی تمہارے جیسوں کہا تو چیخ کر بولا تھا۔

”آپ کو پتہ ہی نہیں کہ میرے جیسے زندگی میں کیسے رنگ بھرتے ہیں۔“

”کیسے؟“ میں نے ہنستے ہوئے یونہی شرارت میں کہا تو جواباً اس نے اچانک میرا ہاتھ تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ بس ایک پل اس کے بعد فوراً احساس ہونے پر وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر خود ہی

رنگوں کی برسات اتر آئی تھی۔ کتنا مبہم سا اظہار تھا۔ گھر آنے تک میں ان چند لفظوں کے حرم میں گرفتار رہی تھی۔

”آپ کہاں چلی گئی تھیں؟“ میں جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوئی سالار نے مجھے دیکھ کر یوں پوچھا جیسے مسلسل مجھے کھوجتا رہا ہو۔

”افق کے اس پار۔“ میں نے کھلتی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو پوچھنے لگا۔

”کس کے ساتھ۔“

”ظاہر ہے آفندی کے ساتھ اور ابھی وہ مجھے وہیں سے لے کر آرہے ہیں۔“ میں نے کہتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا آفندی آرہے تھے۔ جیسے ہی میرے قریب آئے سالار اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

”سریہ آپ نے بہت اچھا کیا، خاتون خانہ کو لے آئے، ان کے بنا گھر بہت سونا سونا لگ رہا تھا۔“

”ہوں!“ آفندی کی آواز صرف میں نے سنی اور ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

ابھی کچھ دیر پہلے آفندی کے مبہم سے اظہار نے مجھے جتنا سرشار کیا تھا اب اتنا ہی سالار کا بے ساختہ اور برملا اظہار پریشان کر رہا تھا۔

”ان کے بنا گھر بہت سونا لگ رہا تھا۔“

اور پھر زندگی کا سارا سکون درہم برہم ہو گیا۔ متضاد کیفیات نے مجھے بے حد ڈسٹرب کر دیا اور یہ ساری ڈسٹربنس ظاہر ہے سالار کی وجہ سے تھی۔ جس کی باتوں بلکہ ہر ہر انداز سے بھرپور زندگی کا احساس ملتا تھا میں چاہتی بھی تو اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ وہ اسی گھر میں میرے آس پاس رہتا تھا۔ ایسے لمحوں میں جب مجھ پر اکٹاہٹ یا بیزارى سوار ہوتی وہ اپنی باتوں سے مجھے کھلکھلانے پر مجبور کر دیتا۔ اور کس کا دل نہیں چاہتا ہنسنے بولنے کو۔ پھر وہ تو اس گھر کے فرد کی طرح

پڑا کیونکہ جہاں اصرار کی بات آئی وہاں وہ رعب سے کام لیتے تھے اور میں فوراً مرعوب ہو جاتی تھی۔

”یہ شخص اپنی منوالیتا ہے اور میری مان لیتا ہے زندگی میں اس کے علاوہ بھی تو کچھ ہے۔ ماننے اور منوانے کا درمیانی عرصہ۔“

میں نے چائے پیتے ہوئے سوچا۔ تبھی ملازم نے آکر ڈاکٹر کے آنے کی اطلاع دی تو آفندی جا کر ڈاکٹر صاحب کو اندر لے آئے۔ چیک اپ کے بعد انہوں نے میڈیسن لکھ کر دیں اور آفندی کے پوچھنے پر ٹینشن بتایا تو انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا تھا جس سے میں اندر ہی اندر ہم سی گئی۔ اگر انہیں میرے ذہنی انتشار کا سبب معلوم ہو گیا تو۔

پھر ڈاکٹر کے جانے کے کچھ دیر بعد انہوں نے ملازمہ کو بلا کر میرے کھانے اور دوا سے متعلق ہدایات دیں اور مجھے مکمل ریٹ کی تاکید کرتے ہوئے آفس چلے گئے۔ میڈیسن لانے کے لئے انہوں نے خانساں کو بھیج دیا تھا۔ میں نے کتنی دیر خود کو اخبار میں مصروف رکھا پھر جب تھک گئی تو سو گئی۔

”ابھی صاحب کا فون آیا تھا انہوں نے آپ کے کھانے اور دوا کا پوچھا اور جب میں نے بتایا کہ آپ اس وقت سو رہی ہیں تو بہت ناراض ہوئے کہنے لگے فوراً اٹھا کر پہلے کچھ کھلاؤ پھر دوا دو۔ میں نے توبی بی.....“

”بس اپنی بکواس بند کرو۔“ میں نے اس کی چلتی ہوئی زبان کے سامنے بند باندھ دیا، پھر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”کھانے میں کیا ہے؟“

”میں نے آپ کے لئے سوپ بنایا ہے صاحب کہہ گئے تھے۔“

”لے آؤ ساتھ میں دو سلاکس بھی۔“ اسے بھیج کر میں نے واش روم کا رخ کیا۔ پانی میں ہاتھ ڈالتے ہی مجھے سردی لگنے لگی۔ جلدی سے دانت برش کر کے دوبارہ کمر میں آ بیٹھی۔ کچھ

بیچھے ہٹ گیا لیکن اس کی ایک پل کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ میں ابھی تک اس سے نکل نہیں پائی۔ بہت چاہا بے خبر سوئے آفندی کے سینے میں منہ چھپالوں کہ یہی میری پناہ گاہ تھی لیکن اس سے پہلے جن آرزوؤں کو بھینٹ چڑھانا تھا وہ سب اس ایک پل کی گرفت میں آ کر میرے مقابل ڈٹ گئی تھیں۔

جانے کتنی رات بیت گئی تھی۔ ذہنی انتشار کے باعث میرا سر درد سے پھٹنے لگا۔ آنکھوں کے پونے الگ بھاری ہو گئے تھے۔ بہت دیر سے آفندی کا ہاتھ تھام کر میں نے اپنی آنکھوں پر رکھ لیا تو یوں لگا جیسے دیکھتے انگاروں پر نرم نرم پھوار برسے گی ہو اور آفندی کو شاید پیش کا احساس ہوا۔ فوراً اٹھ گئے اور میری آنکھوں پر رکھا اپنا ہاتھ ذرا سانیچے کر کے میرا چہرہ اپنی طرف موڑتے ہوئے تشویش سے بولے۔

”تو بیہ تمہیں بخار ہو رہا ہے تم نے بتایا نہیں۔“ اور میری آنکھوں میں اس روانی سے پانی اتر ا کہ کناروں سے جھلک گیا۔

”اول ہوں!“ وہ بہت نرمی سے میرے آنسو میٹ کر بولے۔

”ٹھہرو میں کوئی ٹیبلٹ دیکھتا ہوں۔“

”نہیں میں سونا چاہتی ہوں۔“ میں نے کروٹ بدل کر ان کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

☆☆☆

صبح تک میرا بخار تیز ہو چکا تھا آفندی نے مجھے اٹھایا نہیں اور جب میں خود سے اٹھی، کافی دن چڑھ آیا تھا۔ آفندی کمرے ہی میں موجود تھے۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر کہنے لگے۔

”میں نے ڈاکٹر کو فون کر دیا ہے آنے والے ہوں گے تم جب تک ناشتا کرو۔“

”نہیں میں بس چائے پیوں گی۔“

میں تکیہ سیدھا کر کے اس کے ساتھ کمر کا کر بیٹھتی ہوئی بولی تو وہ خود ہی چائے لینے چلے گئے۔ واپس آئے تو چائے کے ساتھ بوائے انڈیا بھی تھا جسے کھلانے کے لئے انہیں اصرار نہیں کرنا

کہا تو وہ حیران ہو کر بولا۔

”کھانا یہ کھانے کا کون سا وقت ہے؟“

”کیا ناظم ہوا ہے؟“ میں نے گھڑی دیکھی چار بج رہے تھے اس حساب سے وہ پوچھنے

لگا۔

”آپ کے لئے چائے لاؤں۔“

”نہیں۔“

”کوئی اور چیز آئی مین پھل وغیرہ؟“

”وہ بھی نہیں۔“

”تو پھر ایسا کریں۔“

”میں صرف آرام چاہتی ہوں۔“

وہ پتہ نہیں کیا کہنے جا رہا تھا میں فوراً بول پڑی تو اس نے گہری سانس کھینچ کر کندھے

اچکائے۔

”نئی کا زمانہ ہی نہیں ہے میں صرف آپ کی سیوا کرنے کے خیال سے بھاگا چلا آیا۔“

بہر حال آج کی تاریخ میں آپ کو بھلا چنگا ہو جانا چاہئے۔ صبح ناشتے کی ٹیبل پر آپ نہیں تھیں تو.....“

”سالار! مجھے گیٹ لاسٹ کہنے پر مجبور مت کرو۔“ میں نے ٹوک کر کہا تو ہنستا چلا گیا۔

پھر اگلے دو دن میں قصداً اپنے کمرے تک محدود رہی اور اس دوران میں نے اپنے

آپ کو سمجھا لیا کہ مجھے ایسی باتوں کو خود پر طاری نہیں کرنا چاہئے نہ ہی سالار کو زیادہ اہمیت دینے کی

ضرورت ہے۔

تیسرے دن شام میں جب آفندی آفس سے آگئے تب میں اپنے کمرے سے نکل آئی

اور کیونکہ پہلے دن کے بعد وہ دوبارہ مزاج پرسی کے لئے بھی میرے کمرے میں نہیں آیا تھا اس لئے

اس وقت مجھے دیکھتے ہی پوچھنے لگا۔

دیر بعد ملازمہ سوپ اور سلاکس لے آئی۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ اس لئے اچھا نہ لگنے کے باوجود میں نے زبردستی دونوں سلاکس کھائے اور سوپ بھی پی لیا۔ پھر تھوڑا وقفہ دے کر میڈیسن بھی لے لیں۔

ملازمہ اسی انتظار میں تھی اور مجھے خود بھی احساس ہوا کہ صرف مجھے کھانا دینے کے لئے وہ رکی ہوئی تھی، ورنہ تو جلد ہی چلی جاتی تھی۔ میں نے بغیر کسی پس و پیش کے اسے جانے کی اجازت دے دی اور کارز سے میگزین اٹھا کر اپنا سارا ادھیان اس میں لگا دیا۔ پتہ نہیں یہ میری شعوری کوشش تھی یا غیر شعوری یا شاید میرے اندر کا خوف تھا۔ میں کچھ اور سوچنا نہیں چاہتی تھی اس لیے ایک ایک لفظ پڑھنے لگی۔

پتہ نہیں کتنے لمحے بیتے یا شاید گھنٹے کہ اچانک خاموشی میں بھاری قدموں کی آواز پر میرا تسلسل ٹوٹ گیا۔ حقیقتاً پہلے مجھے آفندی کا خیال آیا اور اسی خیال کے تحت میں میگزین سے نظریں ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ تب ہی دستک کے بعد ذرا سا دروازہ کھول کر سالار نے اندر جھانکا اور مجھے بیٹھے دیکھ کر اندر آتا ہوا بولا۔

”صبح انکل نے بتایا آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آئی ایم سوری میں اس وقت آپ کی عیادت کیے بغیر چلا گیا۔ اب کیسی ہیں آپ؟“

میں نے کوئی جواب دیا نہ اس پر سے نظریں ہٹائیں کیونکہ میرا وجود جیسے پتھر ہو گیا تھا اور میری خاموشی سے زیادہ براہ راست نظروں سے وہ کچھ گھبرا کر بولا۔

”کل شام میں تو آپ ٹھیک تھیں پھر اچانک کیا ہوا۔“

اور میرا دل چاہا ایک ہی جست میں اس تک پہنچ کر اس کا گریبان پکڑ کر چیخوں ”تم نہیں جانتے اچانک کیا ہوا یہ سب کیا دھڑاتہارا ہے۔“ لیکن کمال ضبط سے اپنے اندر کے شور کو دبا کر میں بے نیازی ہو گئی۔

”پتہ نہیں شاید سردی لگ گئی تم جاؤ کھانا وغیرہ کھاؤ۔“ میں نے نظروں کا زاویہ بدل کر

کے مطابق پہلے کچن میں جھانکا کیونکہ پچھلی طرف کھلنے والا دروازہ عموماً خانساں بند کرنا بھول جاتا تھا۔ اسے چیک کرنے کے بعد میں لاؤنج میں آئی تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا کیا کروں۔ گھڑی پر نظر ڈالی ابھی صرف دس بجے تھے اور سردی کی وجہ سے لگ رہا تھا جیسے بہت رات بیت گئی ہو۔

مجھے نیند نہیں آرہی تھی اور پھر نائٹم دیکھ کر تو میں اور مطمئن ہو کر ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئی۔ طویل دورانیے کا کھیل تھا وہ بھی میرے فیورٹ اشارز کا جو کتنے عرصے بعد ایک ساتھ نظر آ رہے تھے۔ اور ظاہر ہے اب ٹی وی کے سامنے سے ہٹنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ بلکہ میں نے سینڈل اتار دی اور پیر اوپر کر کے پوری صوفے میں دھنس گئی۔ پھر شال کھول کر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ لی۔

ایسے ڈرامے میں پہلے بھی اسی طرح ذوق و شوق سے دیکھتی تھی۔ اور اگر درمیان میں کوئی بولتا تو مجھے سخت ناگوار گزرتا تھا خصوصاً حنا اس وقت بہت چھوٹی تھی اور میں بھابھی سے کہتی پہلے اسے سلا کر آئیں۔ خیر یہاں تو ایسا کوئی نہیں تھا آفندی کو سرے سے ڈرامے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔

میں پوری یکسوئی سے ڈرامہ دیکھ رہی تھی کہ اچانک عقب سے سالار کی آواز نے مجھے یوں چونکا دیا کہ میں اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ حالانکہ وہ بہت سیدھے سادے انداز میں بولا تھا کہ آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں لیکن ایکدم سے آواز آئی اس لئے میں بری طرح چونکی اور وہ سامنے آتا ہوا بولا۔

”ارے آپ تو ڈر گئیں۔“

”تمہیں اس طرح نہیں آنا چاہیے تھا۔“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”کس طرح؟“ اس نے انجان بن کر پوچھا تو میں سر جھٹک کر ٹی وی پر نظریں جماتی

ہوئی بولی۔

”بس اب خاموش رہو، میں ڈرامہ دیکھ رہی ہوں۔“ اس نے ایک نظر ٹی وی پر ڈالی

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

میں نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ پھر وہیں سے رئیس کو پکار کر چائے کا کہا اس کے بعد آفندی کے پاس آ کر بیٹھی تو وہ کہنے لگے۔

”آج بھائی صاحب کا فون آیا تھا کچھ ناراض لگ رہے تھے اگر تم بہتر محسوس کر رہی ہو تو چلیں۔“

”چلیں۔“ میں نے فوراً ہائی بھر لی تو مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

”کوئی گرم کپڑا پہن لو باہر ہوا بہت سرد ہے۔“

میں بغیر کسی پس و پیش کے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ الماری میں سے سوئیٹر نکال کر پہنا پھر شال بھی لے لی اور آئینے میں اپنا جائزہ لے کر واپس آئی تو وہ دونوں چائے پی رہے تھے۔ وہ دیکھتے ہی پوچھنے لگا۔

”آپ کے لئے چائے بناؤں؟“

”نہیں رہنے دو، چلیں آفندی؟“ میں نے اسے جواب دے کر آفندی سے کہا تو وہ کپڑے میں رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

واقعی اندر تو پتہ نہیں چل رہا تھا باہر نکلتے ہی سردی کا احساس ہوا اور میں کیونکہ بیماری سے اٹھی تھی اس لئے بھی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔

بھائی صاحب کے گھر ہم بہت دیر بیٹھے رات کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ ان کی بیٹی عائشہ جو خرم سے چھوٹی تھی وہ بھی سسرال سے آئی ہوئی تھی اور اس سے چھوٹی بیلا بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ دونوں بہنوں کے ساتھ میرا اچھا وقت گزرا بلکہ میں بڑے آرام سے بیٹھی تھی۔ آفندی کو ٹوکنا پڑا کہ گھر نہیں چلنا۔ تب میں ہنستی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور آتے ہوئے بیلا سے کہا کہ وہ کچھ دن میرے پاس آ کر رہے اور اس نے مسٹر کے بعد آنے کا وعدہ کیا۔

پھر گھر آتے ہی آفندی سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے اور میں نے عادت

”سٹاپ۔“ میں جھٹکے سے کلائی چھڑا کر پیچھے ہٹتی ہوئی بولی۔

”آفندی تمہاری طرح نہیں ہیں۔“

”ہو بھی نہیں سکتے۔“

میں نے پیشانی پر بے شمار شکنیں ڈال کر دیکھا تو فوراً وضاحت کرتا ہوا کہنے لگا۔

”میرا مطلب ہے جب وہ میری عمر کے تھے تب وہ بھی ایسے ہی تھے اب تو بیچارے

بوڑھے ہو گئے ہیں۔“ اف میرا وجود برف ہو گیا۔ پیشانی کی لکیریں آپ ہی آپ صاف ہو گئیں

اور میں بے حد خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ جو آفندی کو بوڑھا کہنے کے بعد اب ان پر

رشتک کر رہا تھا۔

”بہت لکی ہیں انکل ابھی بھی ہم جیسوں کو مات دے گئے۔ ہے ناں!“

اچانک اس نے میری آنکھوں میں اپنی نظریں اتار کر پوچھا۔ تو میرے پورے وجود

میں جیسے انگارے بھر گئے۔ بہت تپش تھی یہاں وہاں ہر طرف جانے کیسا لاؤ تھا۔ میرا دل چاہا میں

ننگے پاؤں اس دہکتے لاؤ میں اترتی چلی جاؤں اور جب میں اس میں سے نکلوں تو میرا وجود چاندی

سے سونا ہو۔

بہت دھیرے دھیرے اس کی طرف سے رخ موڑ کر میں نے ٹی وی کا بٹن آف کیا پھر

جیسے خواب میں چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆☆☆

صبح ناشتے کی ٹیبل پر میں گم صم تھی۔ جب کہ وہ سر جھکائے ناشتا کرنے میں مصروف تھا

اور ناشتے کے ساتھ اخبار پڑھنے میں مصروف ہونے کے باوجود آفندی نے غالباً میری غیر معمولی

خاموشی کو محسوس کیا، جب ہی اخبار ایک طرف رکھ کر انہوں نے پہلے ایک نظر اس پر ڈالی پھر پوری

طرح میری طرف متوجہ ہو کر بولے۔

”کیا بات ہے تم اتنی خاموش کیوں ہو؟“

پھر مجھے دیکھنے لگا تو میں نے کوئی توجہ نہیں دی لیکن کچھ دیر بعد مجھے الجھن ہونے لگی کیونکہ جس طرح

میں ٹی وی پر نظریں جمائے بیٹھی تھی اسی طرح وہ مجھ پر نظریں مرکوز کئے ہوئے تھا اور یقیناً اس کا

مقصد میری توجہ حاصل کرنا تھا اور میں نے اپنی طرف سے اس کی توجہ ہٹانے کو کہا۔

”ڈرامہ دیکھو زبردست موضوع ہے۔“

”میں ڈرامہ نہیں دیکھتا۔“

”تو پھر مجھے ڈسٹرب مت کرو۔“ میں بے اختیار کہہ گئی تو حیران ہو کر بولا۔

”میں آپ کو کہاں ڈسٹرب کر رہا ہوں آپ کے کہنے سے بالکل خاموش تھا ابھی آپ

نے بات کی تو.....“

”اچھا بس اپنے کمرے میں جاؤ۔“ میں نے چڑ کر کہا۔

”نہیں میں یہیں بیٹھوں گا.....“ اس نے کچھ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو میں اٹھ کھڑی

ہوئی اور ٹی وی بند کرنے کے ارادے سے آگے بڑھی تھی کہ اس نے میری کلائی تھام لی۔

”ڈرامہ تو پورا دیکھ لیں۔“

”میرا ہاتھ چھوؤ۔“ اس کی بے ساختہ جسارت نے مجھے پوری جان سے سلگا دیا اور

میں کچھ ایسے تیکھے لہجے میں بولی کہ جس سے وہ فوراً میرا ہاتھ چھوڑ دے گا لیکن اس کے برعکس وہ ضد

میں آ گیا۔

”چھڑا سکتی ہیں تو چھڑا لیں۔“

”دیکھو سالار میں ایسی بدتمیزی پسند نہیں کرتی۔“ میرے انتہائی غصے کے باوجود وہ

بڑے آرام سے بولا۔

”آپ پسند کریں نہ کریں ہم جیسے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

میں ہونٹ بھیجنے کی کوششیں نظروں سے گھورنے لگی تو شرارت سے بولا۔

”باپ رے اتنا غصہ ایسی نظروں سے آفندی انکل کو دیکھیں گی تو.....“

”پھر روکیوں رہی ہو؟“

”پتہ نہیں۔“

”بیوقوف! سالار نے کچھ کہا ہے؟“

”نہیں۔“

اور اس بار نہیں کہتے ہوئے میری آنکھوں میں جو پانی اترا، اسے انہوں نے بغور دیکھا۔ پھر کوئی سوال نہیں کیا اٹھ کر بیٹھے اور کارنز سے سگریٹ اٹھا کر سلگانے لگے تو میں جانے کیوں اندر ہی اندر ڈر گئی۔ کہیں میرے آنسوؤں نے میرا اندر آشنا تو نہیں کر دیا۔

صبح چھٹی کا دن تھا۔ ناشتے کے بعد آفندی لاؤنج میں سالار کے ساتھ بیٹھے جانے کون سا موضوع چھیڑے ہوئے تھے اور اس دن کے بعد سے میں قصداً سالار سے گریز کرنے لگی تھی۔ وہ خود بھی جہاں مجھے دیکھتا کتر کر نکل جاتا لیکن اس وقت محض اس خیال سے کہ کہیں آفندی محسوس نہ کریں یا شاید میرے دل کا چور تھا جو مجھے ان کے پاس لے آیا۔

”آفندی دوپہر کے کھانے میں کیا کھائیں گے۔“ مجھے اور کچھ نہیں سوچا تو کھانے کا پوچھ لیا۔ انہوں نے قدرے توقف کیا پھر اس کی طرف اشارہ کر کے بولے۔

”سالار سے پوچھو یہ کیا پسند کرتا ہے؟“

”نوسر میں کھانے پر موجود نہیں ہوں گا۔“ اس نے شاید مجھے مشکل سے بچا لیا۔

”کیوں؟“ آفندی کے استفسار پر کہنے لگا۔

”بس ذرا گھومنے پھرنے کا پروگرام ہے۔“

”گھومنے پھرنے کا کھانے سے کیا تعلق! کہیں بھی جاؤ کھانا گھر آ کر کھانا؟“ آفندی

اس سے کہہ کر فوراً مجھے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

”تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”جی؟“

”انہوں نے چپ شاہ کا روزہ رکھا ہے۔“

مجھ سے پہلے وہ بول پڑا لیکن آفندی یکسر نظر انداز کر گئے۔ اور نرمی سے میری کلائی پر ہاتھ رکھ کر غالباً دیکھنے لگے کہ کہیں مجھے بخار تو نہیں ہو گیا۔ ساتھ ہی پوچھا۔

”طبیعت ٹھیک ہے ناں!“

میں کچھ نہیں بولی تھی اور جس طرح انہوں نے نرمی سے میری کلائی پر ہاتھ رکھا تھا اسی طرح بہت نرمی سے میں نے ان کی انگلی تھام کر ان کا ہاتھ پرے ہٹا دیا۔ پھر کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے یونہی میری نظر اس پر پڑی وہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔

اور پھر ہمارے درمیان ایک نادیدہ دیوار آن کھڑی ہوئی۔ اگر اسے احساس ہوا تھا تو بہت دیر ہو گئی تھی کہ اپنے جیسوں کی اہمیت جتاتے ہوئے جو لاؤ اس نے میرے اندر دکھایا تھا اس کی تپش سے وہ خود بھی محفوظ نہیں رہا تھا۔

میں نے اسے چیلنج تو نہیں کیا تھا، بس اپنے آپ ہو گیا اور اب کوئی راہ فرار نہیں تھی۔ آفندی کی پناہوں میں چھپ کر بھی مجھے شانتی نہیں ملتی تھی۔ میں خود کو ملامت کرتے کرتے تھک جاتی تو تکیے میں منہ چھپا کر چپکے چپکے رونے لگتی۔

اس رات میں یونہی آنسو بہا رہی تھی کہ اچانک آفندی نے میرا بازو تھام کر مجھے اپنی طرف موڑا، ان کی آنکھیں بند تھیں میں جلدی جلدی اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔ اور میرے ہاتھوں کی حرکت سے انہوں نے ذرا سی آنکھیں کھول کر دیکھا تب انہیں میرے رونے کا پتہ چلا۔ کچھ حیران ہو کر بولے۔

”کیا بات ہے تم رورہی ہو؟“

اور میں نے چاہا کہ ان کے سینے میں منہ چھپا لوں لیکن اس سے پہلے انہوں نے میرے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر میرا چہرہ اونچا کیا اور پھر اپنی بات دہرائی۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا جیسے کوئی بات نہیں۔

”بہت پیارا بالکل اپنے نانا پر گیا ہے۔“ اس نے بہت خوش ہو کر بتایا اور فوری طور پر میں سمجھی نہیں، جیسی الجھ کر بولی۔

”نانا۔“

”جناب آپ میرے بچے کی نانی اماں کہلائیں گی۔“ اس نے کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔

”ہاں اماں بنی نہیں نانی اماں بن گئی۔“

”دیکھ لو میں نے تمہیں کیا کیا بنادیا۔“ اس نے اکر کر کہا تو جانے کیوں میں چپ سی ہو گئی۔ اور خدا حافظ کہے بغیر ریسور رکھ دیا۔ پھر خود پر قابو پانے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ اس کے بعد لاؤنج میں آئی تو آفندی کو اکیلے دیکھ کر شکر کیا اور ان کے سامنے بیٹھتی ہوئی بولی۔

”سنیچہ کا فون تھا اسی ہفتے پاکستان آرہی ہے۔“

”اچھا!“ ان کا سنجیدہ چہرہ چمک اٹھا۔

”کب؟ آئی مین کس تاریخ کو؟“

”تاریخ تو اس نے نہیں بتائی۔“

”اکیلی آرہی ہے یا خرم کے ساتھ۔“ اُف یہ سب اس سے میں نے کب پوچھا تھا اور پتہ نہیں کہنا بھی عجیب سا لگا، صد شکر کہ بروقت جواب سوچ گیا۔

”بیٹے کے ساتھ۔“ اور یہ واقعی چونکا دینے والا سر پر اتر تھا۔

”اچھا تو میری بیٹی بیٹے کی ماں بن گئی ہے!“

آفندی اس وقت صرف اور صرف سنیچہ کے باپ لگ رہے تھے۔ ان کے لہجے میں حد درجہ شفقت تھی اور چمکتے ہوئے چہرے پر خوشگوار احساس کے ساتھ آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے اس گھر میں بیٹھے سنیچہ کے سارے ماہ و سال ان کی نظروں سے گزر رہے ہوں۔

اور یہ فطری سی بات تھی جو ایک باپ یہ سوچ رہا تھا کہ ابھی کل ہی ان کی بیٹی اتنی سی تھی اور اب اتنی بڑی ہو گئی، میں انہیں ان کے ماضی میں چھوڑ کر چپ چاپ اپنے کمرے میں آگئی۔

میں واقعی نہیں سمجھی اور اس سے پہلے کہ وہ وضاحت کرتے فون کی بیل نے ان کی اور میری توجہ بھی کھینچ لی اور انہیں اُنھنے پر آمادہ نہ دیکھ کر میں لابی میں آگئی۔ ریسور اٹھا کر ہیلو کہا، دوسری طرف سنیچہ تھی۔ میری آواز سننے ہی بغیر دعا سلام کے کھلتی ہوئی آواز میں بولی۔

”ٹوپی میں ماں بن گئی ہوں۔ اس کے جملے پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔“

”سچ! کیا ہوا ہے؟“

”تم بوجھو لیکن دس سوالوں سے زیادہ نہیں۔“ وہ غالباً خوشی سے بوکھلائی ہوئی تھی میں

چنچ پڑی۔

”دماغ صحیح ہے تمہارا، بیٹیا بیٹی یہ دس سوال کہاں سے آگئے۔“

”بھئی پہلے اس کا رنگ روپ پوچھو پھر یہ کہ کس پر گیا ہے اس کے بعد.....“

”بس میں سمجھ گئی بیٹا ہے مبارک ہو۔“ میں نے نوک کر کہا تو وہ ہنس پڑی پھر پوچھنے

لگی۔

”پاپا کہاں ہیں؟“

”گھر پر ہیں بلاؤں؟“

”نہیں ان سے پھر بات کروں گی بلکہ میں خود آرہی ہوں۔“

”سچ کب آرہی ہو؟“

”اسی ہفتے۔“

”ایمان سے سنیچہ تم نے خوش کر دیا ورنہ میں تو.....“ میں نے ا یکدم نکلا ہونٹ دانتوں

میں دبایا۔

”کیا بات ہے پاپا کے ساتھ انڈرا سٹینڈنگ نہیں ہوئی تمہاری؟“ میری ادھوری بات

پر وہ جو بھی اس حساب سے پوچھنے لگی تو میں بات ہی بدل گئی۔

”بچہ کیسا ہے؟“

”رات بھی تم رو رہی تھیں میری کوئی بات بری لگی۔“

”نہیں، بس بیماری کے بعد میری طبیعت ٹھیک نہیں ہو رہی عجیب گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔“ میں کچھ بے ربطی جو کہہ سکی کہہ دیا۔

”چلو کسی اچھے اسپیشلسٹ سے تمہارا چیک اپ کرا دوں۔ ہری آپ۔“

اور وہ اپنی بات منوالیتے تھے۔ میری مان لیتے تھے ماننے اور منوانے کا درمیانی عرصہ جو زندگی میں رنگ بھرتا ہے اس کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ یہ ساری باتیں میں نے پہلے کب سوچیں تھیں یا پھر اب میرا دل سودائی کیوں ہو گیا تھا۔ بہت بے دلی سے میں اٹھ کر ان کے ساتھ باہر نکلی تھی۔

پھر چیک اپ کے دوران ڈاکٹر نے مختلف سوالات کیے اور جب اس نے بچوں کی بابت پوچھا تو میں جواب دینے کی بجائے دزدیدہ نظروں سے آفندی کو دیکھنے لگی۔ وہ بہت مطمئن تھے اسی لاپرواہی سے بولے۔

”چائلڈ از نو پرا بلم۔“

ان کے لئے تو واقعی نو پرا بلم..... لیکن انہیں میری کوکھ خالی رکھنے کا بھی کوئی حق نہیں جب ہی ان کا جواب سنتے ہی ڈاکٹر کے کمرے سے نکل آئی اور بغیر کہیں رکے گاڑی میں آ بیٹھی۔ کچھ دیر بعد وہ آئے تو گاڑی اشارٹ کرتے ہوئے ایک نظر مجھ پر ڈال کر تنبیہی لہجے میں بولے۔

”یہ کیا حرکت تھی؟“ میں کچھ نہیں بولی اور چہرہ دوسری طرف موڑ کر شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

پھر شام میں آفندی سنیہ کی آمد کے بارے میں ٹھیک سے معلوم کرنے کہ وہ کون سی تاریخ کو آ رہی ہے خرم کے ساتھ یا..... وغیرہ وغیرہ بھائی صاحب کے گھر چلے گئے۔ میری طبیعت کی ٹراپی کے باعث انہوں نے مجھے ساتھ چلنے کو نہیں کہا تھا البتہ جاتے جاتے مجھے آرام کرنے کی تاکید کر گئے تھے اور میں ”چائلڈ از نو پرا بلم“ سے کچھ اتنی متنفر سی ہو رہی تھی کہ ان کی ہدایت پر عمل

اچانک مجھے اپنا وجود بہت خالی خالی لگنے لگا۔ اور بالکل غیر ارادی طور پر میں اپنا موازنہ سنیہ کے ساتھ کرنے لگی۔ جو خواب اس نے دیکھے تھے ان کے شرمندہ تعبیر ہونے پر وہ خوش تھی اور میں..... میرے خوابوں کو بھی تو زندگی ملی تھی پھر.....

”وہ اظہار نہ کرے تب بھی اس کے وجود سے صرف محبت کا احساس ملے۔“

صحیح ہے میں نے ایسا چاہا تھا لیکن میں یہ کب جانتی تھی کہ اپنے وجود سے محبت کا احساس دینے والا میرے وجود کو خالی چھوڑ دے گا۔ جیسا کہ بھابھی نے کہا تھا۔

”وہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتا نہ محبت نہ اولاد۔“

اور صرف محبت کے احساس کو پا کر تو میری ذات کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ جب ہی غیر معمولی تحفظ کا احساس بخشنے والی آفندی کی پناہ گاہ میں چھپ کر بھی کبھی کبھی مجھے اپنا آپ محفوظ نہیں لگتا تھا۔

اور ابھی سنیہ کے ساتھ اپنا موازنہ کرتے ہوئے مجھے ادراک ہوا کہ میں غیر محفوظ ہوں۔ بھابھی کے احساس دلانے پر تو مجھے کبھی احساس نہیں ہوا اور اب اچانک.....!

”ٹو بیہ۔“ آفندی کی آواز نے میری سوچوں کو منتشر کر دیا۔ اور میں چونک کر اٹھنا چاہتی تھی کہ وہ پکارتے ہوئے اندر آ گئے۔ مجھے دیکھ کر جانے کیوں ٹھٹھکے (شاید کسی محرومی کا عکس میرے چہرے پر جھلک آیا تھا) پھر قریب آ کر بیٹھے اور آہستہ آہستہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھنے لگے۔

”کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو؟“

”نہیں!“ میں نے اپنی کلائی میں پڑی چوڑی گھماتے ہوئے دھیرے سے جواب

دیا۔

”ادھر دیکھو میری طرف۔“ میں نے ذرا سا سراونچا کر کے دیکھا تو کہنے لگے۔

”اب بتاؤ کیا بات ہے؟“

”آئیے اندر چلیں۔“

اس نے میری طرف یوں ہاتھ بڑھایا جیسے میں اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر اٹھوں گی اور میں بہت خاموشی سے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔

”کبھی کبھی ہم جیسوں کا ہاتھ تھام لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔“

اس کے لہجے کا دکھ میرے اندر تک اتر گیا بہت کوشش سے میں ستون کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی اور اس کی طرف دیکھے بغیر سیدھی اپنے کمرے میں آ گئی۔

اس رات میں ایک پل کے لئے بھی نہیں سو سکی۔ میری زندگی کی ناؤ طوفانوں کی زد میں آ گئی تھی۔ اور تمام رات میں ان طوفانوں سے لڑتی رہی۔

فجر کی اذانیں ہونے لگیں تب بھی میری کشتی بیچ بھنور میں تھی اور میں لڑتے لڑتے تھک گئی تھی اس سے پہلے کہ بالکل ہار جاؤں میں نے اٹھ کر وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑی ہو گئی۔ آنسو میری پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر میرے پیروں پر گرتے رہے اور جب دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے تو ہتھیلیاں تر ہو گئیں۔

”میرے رب مجھے وہ راستہ دکھا جو تو میرے لئے پسند کرتا ہے۔“

اور اپنا معاملہ اپنے پیدا کرنے والے پر چھوڑ کر میں اطمینان سے سو گئی۔ پتہ نہیں آفسر جاتے ہوئے آفندی نے مجھے اٹھایا کہ نہیں مجھے کچھ خبر نہیں۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی سارا دن سوتی رہی۔

چار بجے کہیں جا کر آنکھ کھلی تو پہلے گرم پانی سے غسل کیا پھر آ کر کھانا کھایا اس کے بعد چائے لے کر لاؤنج میں آ بیٹھی۔ رات کی سوچوں سے مجھے چھٹکارہ تو نہیں ملا تھا لیکن وہ کشاکش بھی نہیں تھی۔ بلکہ طوفانوں سے نکل کر اب میری ناؤ بہت سہولت سے اپنا راستہ تلاش کر رہی تھی۔ تبھی سالار آ گیا بس سلام کرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ میں نے بے اختیار پکار لیا۔

”سنو سالار!“ وہ رک گیا لیکن پلٹ کر دیکھا نہیں تو میں نے چائے کا سپ لینے کے بعد کہا۔

کرنے کی بجائے ان کے جاتے ہی برآمدے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ ٹھنڈا فرش، ٹھنڈا ستون جس کے ساتھ اپنا کندھا لگا یا تو پورے وجود میں سرد لہر دوڑ گئی پھر بھی میں اسی طرح بیٹھی رہی۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ دور آسمان پر ابھی کوئی ستارہ نہیں چمکا تھا نہ پرندوں کے جھنڈ نظر آئے۔ میری نظریں جانے کس چیز کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں پتہ ہی نہیں چلا کب سالار آیا۔ غالباً سیدھا اندر جا رہا تھا مجھ پر نظر پڑی تو ٹھٹھک کر رکا اور کچھ تعجب کچھ تشویش سے پوچھنے لگا۔

”آپ‘ آپ یہاں کیوں بیٹھی ہیں؟“ اور میرے اندر کا غبار جسے آفندی باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے اچانک ابل پڑا۔

”تمہیں اس سے کیا میں کہاں بیٹھوں‘ میرا گھر ہے تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔“ وہ جو سیڑھی پر پاؤں رکھتے قدرے میری طرف جھکا ہوا تھا فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”میں کوئی بھی نہیں ہوں تب بھی آپ کو یہاں نہیں بیٹھنے دوں گا اندر چلیں۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ فضا میں خنکی بڑھ رہی ہے اور آپ نے کوئی گرم کپڑا بھی نہیں پہنا۔“

وہ حتی الامکان لہجے پر قابو پا کر دھیرج سے بات کر رہا تھا اور اسی قدر خود سری پر آمادہ ہو

کر بولی۔

”تمہیں کیا زیادہ سے زیادہ بیمار پڑوں گی یا مر جاؤں گی تمہارا تو کوئی نقصان نہیں

ہوگا۔“

”نقصان تو جو ہونا تھا ہو گیا۔“ اس نے کہتے ہوئے سروانچا کر کے شفاف آسمان کو دور

تک دیکھا پھر گہری سانس سینے کے اندر دبا کر پوچھنے لگا۔

”آفندی انکل کہاں ہیں؟“ میں اس کی پہلی بات سے کچھ سنائے میں تھی اس لئے

جواب نہیں دے سکی۔

”پلیز“ میں نے اٹھ کر اسے بولنے سے روک دیا پھر اٹھتی ہوئی بولی۔

”تم چل جاؤ خدا را چلے جاؤ!“

”ایسے نہیں جاؤں گا۔“

وہ میرے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا اور کوئی راہ فرار نہ پا کر میں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ جانے کیوں وہ اتنا کٹھور ہو گیا تھا اسے میرے رونے کا کچھ اثر نہیں ہوا تب ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے میں نے خود کو بہت بے بس محسوس کیا اور اس کی طرف سے رخ موڑ کر بولی۔

”جس ان دیکھی آگ میں تم جلتے رہے ہو اس سے دامن بچاتے بچاتے میں تھک گئی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ تمہارے جیسے زندگی میں رنگ بھرتے ہیں اور مجھ پر اس کا ادراک تب ہوا جب اپنے لئے بے آب و رنگ زندگی کا انتخاب کر کے میں اس میں داخل ہو چکی تھی۔ اب میرے پاس کوئی راستہ نہیں بجز اس بے آب و رنگ زندگی سے سمجھوتا کرنے کے۔“

میں خاموش ہوئی تو جیسے ساری کائنات تھم گئی۔ کتنے لمحے سرک گئے۔ کہیں کوئی آواز نہیں تھی تب گھبرا کر میں نے پلٹ کر دیکھا تو وہ زندہ رہنے کا بہانا لے کر بہت شکستہ قدموں سے جا رہا تھا۔

میرے ہونٹ ذرا سے نیم وا ہوئے۔ شاید اسے پکارنے کے لئے لیکن اس سے پہلے ہی میرا ہاتھ آپ ہی آپ میرے ہونٹوں پر آن ٹھہرا جیسے آفندی کی گلیہرتا میرے تقاضوں کے سامنے چپکے سے بند باندھ دیتی ہے۔

☆☆☆

”تمہیں پتہ ہے سنیہ آرہی ہے۔“

”جی رات انگل نے بتایا تھا۔“ اس نے کہا لیکن میں ان سنی کرتی ہوئی بولی۔

”اور میں چاہتی ہوں کہ اس کے آنے سے پہلے تم یہاں سے چلے جاؤ۔“ اور وہ جوا بھی

تک دوسرے رخ پر کھڑا تھا ایک دم میری طرف پلٹا اور چند قدم آگے آ کر بولا۔

”کیوں آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں؟“

”کوئی خاص وجہ نہیں۔“

پتہ نہیں کیسے میرے اندر اتنا سکون آ گیا تھا جیسے کل وہ دھیرج سے بات کر رہا تھا اور میں تلملارہی تھی اب میری جگہ وہ تھا۔

”وجہ ہے اور اگر آپ ایمانداری سے اعتراف کر لیں تو میں اسی وقت چلا جاؤں گا ورنہ نہیں آپ ہاتھ جوڑ کر منت کریں گی تب بھی نہیں۔“

آف.....! میرا پورا وجود سن ہو گیا اور وہ مزید دو قدم آگے آ کر میرے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھا اور مجھے اپنی نظروں کی گرفت میں لے کر کہنے لگا۔

”مجھے واقعی چلے جانا چاہئے اور میں جانا چاہتا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ آفندی انگل سے پہلے میرے جیسا کوئی ایک آپ کی زندگی میں آیا ہوتا تو آپ اسے نظر انداز نہیں کر سکتی تھیں۔“

میں نے چونک کر دیکھا مذاق میں کہی بات کو نہ جانے کیوں اس نے انا کا مسئلہ بنالیا تھا۔ تو ہین، چیلنج یا پھر کوئی اور بات! کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو قدرے رُک کر پوچھا۔

”اس اعتراف سے تمہیں کیا ملے گا؟“

”زندہ رہنے کا بہانا!“ وہ فوراً بولا پھر نظریں چرا کر کہنے لگا۔

”ایک ان دیکھی آگ جس میں میں سلگتا رہا ہوں سلگتا رہوں گا اگر یقین مل جائے کہ

میرے ساتھ کوئی اور بھی جلتا ہے تو.....“

دل کا دروازہ کھلا ہے

جس نے بھی سنا، کچھ دیر کو تو اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ خود نو میہ حسن سناٹے میں آگئی تھی۔ حالانکہ وہ کم ہی کسی بات پر حیران ہوتی تھی بلکہ شاید ہی کبھی کسی نے اسے حیران ہوتے دیکھا ہو اور چونکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گویا اس کے نزدیک سب کچھ ممکن تھا، یعنی اگر کسی دن اسے یہ خبر سنائی جاتی کہ آج سورج مشرق کی بجائے مغرب سے طلوع ہوا تو وہ چونکے بغیر کہتی۔

”تو کیا ہوا! روز ہی تو مشرق سے نکلتا ہے، آج مغرب سے سہی۔“

اور وہی نو میہ حسن اس وقت سناٹے میں کھڑی تھی۔ باقی لڑکیاں الگ اپنی جگہ بت بنیں حرا کو دیکھ رہی تھیں، جس نے یہ خبر سنا کر سب کو تو دشت حیرت میں دھکیل ہی دیا تھا اور اب خود مسکرا مسکرا کر ایک ایک کی شکل دیکھ رہی تھی۔ پھر سب سے پہلے سمیرا سناٹے سے نکلی تو اپنی سماعتوں یہ شبہ کرتی ہوئی بولی۔

”شاید میرے سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ کیا کہا تھا حرا تم نے۔ ذرا پھر سے کہنا!“

”اور جو یہاں خوفناک حالات پیدا ہونے والے ہیں۔ وہ یعنی غزنوی کو دور سے پڑیں گے تو وہ کبھی زور زور سے چیخیں گے، چلائیں گے اور کبھی اونچے اونچے قہقہے ہا ہا۔“

وہ باقاعدہ پورا منہ کھول کر پاگلوں کی طرح ہا ہا ہا کی آواز نکال رہی تھی کہ اسی وقت غزنوی آگئے اور انہیں دیکھ کر وہ بجائے خائف ہونے کے ڈھٹائی سے ہنسی ہوئی بولی۔

”میں آپ کی نقل اتار رہی تھی۔ میرا مطلب ہے اگلے چند دنوں میں آپ کچھ اسی قسم.....“

”شٹ آپ!“ انہوں نے بہت سخت لہجے میں اسے خاموش کر دیا لیکن وہ کہاں خاموش ہونے والی تھی۔ سمیرا کو دیکھ کر بولی۔

”دیکھو! علامات ظاہر ہو رہی ہیں۔“

”خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔“ سمیرا نے دانت پیسے، پھر فوراً غزنوی کو دیکھ کر کہنے لگی۔

”آئیے غزنوی بھائی، بیٹھیں ناں!“

”کیا کر رہی ہو تم سب! لگتا ہے کوئی خاص میٹنگ ہو رہی تھی۔“ انہوں نے سب کو دائرے میں بیٹھے دیکھ کر کہا۔

”نہیں غزنوی بھائی! ہم تو بس یونہی.....“

”آپ کی دماغی حالت پر تبصرہ کر رہی تھیں۔“ اس نے سیمہ کی بات درمیان ہی میں اچک لی، تو جہاں باقی سب لڑکیاں شپٹا گئیں، وہاں غزنوی اسے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے بولے۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”پہلے یہ بتائیں، مجھ سے شادی کا فیصلہ آپ نے دل سے کیا ہے یا دماغ سے؟“

اس سے ہر قسم کی بے باکی اور بدتمیزی کی توقع کی جاسکتی تھی، پھر بھی لمحہ بھر کو غزنوی چکرا گئے۔ گویا امید نہیں تھی کہ سب کی موجودگی میں وہ براہ راست ایسا کوئی سوال کرے گی۔ بہر حال

اور حرا بیٹھتے ہوئے بولی۔

”مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا لیکن باقاعدہ تصدیق کر کے آ رہی ہوں کہ غزنوی بھائی نے شادی کے لیے نومیہ حسن کو پسند کر لیا ہے۔“

”تصدیق تمہیں غزنوی کے ہوش و حواس کی کرنی چاہیے کہ آیا سلامت ہیں کہ نہیں۔“

اس بار نومیہ سنائے سے نکل کر بولی تو سیمانے اسے دیکھ کر مزید حیرت کا اظہار کیا۔

”یعنی تمہیں بھی یقین نہیں آ رہا۔“

”ہاں نومیہ! تمہارے لیے تو کوئی بات نئی ہوتی ہے نہ اہم بلکہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے پھر؟“

سمیرا نے اسے متوجہ کر کے کہا تو وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”میں حیران نہیں ہوں بلکہ تشویش میں مبتلا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“

”مجھے غزنوی کی دماغی حالت پر شبہ ہو رہا ہے، یقیناً ان کا کوئی اسکرودھیلا ہو گیا ہے اور یہ بڑی خطرناک بات ہے۔“

وہ کہہ کر خود ہی ہنسی جب کہ باقی سب نے برا سامنہ بنایا۔ کیونکہ غزنوی کے بارے میں یہ بات کسی کو پسند نہیں آئی تھی۔

”میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ وہ سب کی ناگواری محسوس کرنے کے باوجود باز نہیں آئی بلکہ دھڑلے سے بولی۔ ”یقیناً غزنوی کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ خود ہی سوچو! کل تک جو شخص مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ آج مجھ سے شادی کی بات کر رہا ہے تو اس کے ہوش و حواس مشتبہ ہوئے کہ نہیں۔ جاؤ بڑے ابا سے کہو، انہیں فوراً کسی مینٹل ہسپتال لے جائیں۔“

”تو یہ نومیہ! ایسی خوفناک باتیں تو نہ کرو۔“ حرا نے اس تصور سے جھرجھری لے کر اسے ٹوکا۔

ان کے آخری الفاظ پر وہ بری طرح سلگ گئی۔

”میں خود نہیں آئی۔ آپ لے کر آئے ہیں مجھے، بڑے آئے گیٹ لاسٹ کہنے والے۔ اور اچھی طرح سن لیں، میں ہرگز ہرگز آپ سے بلکہ کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔“

وہ اپنی بات ختم کر کے دندناتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی۔ سخت غصے میں تھی۔ دل چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھالے۔ اگر اس وقت بڑے ابا گھر پر موجود نہ ہوتے تو وہ ضرور ایسا ہی کرتی، بس ایک ان ہی سے تو کچھ ڈرتی تھی۔ باقی تو کسی کا کوئی لحاظ نہیں تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر مسلسل بڑبڑانے کے ساتھ خواہ مخواہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پٹختے لگی۔ جس سے امی کی گود میں سوئی ننھی سامعہ ڈر کر رونے لگی تو امی اس پر بگڑنے لگیں۔

”دماغ خراب ہے تمہارا؟ ذرا احساس نہیں۔ بچی کو کچی نیند سے اٹھا دیا۔“

”یہ سوری تھی؟“ اس نے جھپٹنے کے انداز میں سال بھر کی سامعہ کو امی کی گود سے اٹھا کر بیڈ پر پٹخ دیا۔ اور غصے سے بولی۔

”کتنی بار کہا ہے اسے گود میں مت سلایا کریں۔“

”کیسی ظالم ماں ہو تم، کس بے دردی سے پٹھا ہے بچی کو۔“

امی تاسف سے کہتی، روتی ہوئی سامعہ کو اٹھانے آگے بڑھیں کہ وہ درمیان میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

”مت اٹھائیں اسے۔“

”ہٹو پرے!“ امی نے اسے دھکا دے کر سامنے سے ہٹایا اور فوراً سامعہ کو اٹھا کر سینے میں بھینچ لیا اور پھر اس پر بگڑنے لگیں۔

”اس ننھی سی جان نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو سارا غصہ اس پر نکالتی ہو۔ اگر اپنے دل میں اس کے لیے نرمی پیدا نہیں کر سکتیں تو سختی بھی مت کرو، ورنہ یہ کبھی تمہیں ماں نہیں سمجھے گی۔“

فوراً سنبھل کر آگے بڑھے اور اسے کلائی سے تھام کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں لے آئے۔ اس دوران اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش میں اس نے ان کے بازو اور ہاتھ کو بری طرح اپنے ناخنوں سے نوچ ڈالا۔ اس کے باوجود ان کی گرفت ڈھیلی نہیں ہوئی اور کمرے میں آتے ہی انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو موڑ کر کمرے کے پیچھے کر لیا جس سے وہ چیخ پڑی۔

”یہ کیا بدتمیزی ہے۔ چھوڑیں میرا ہاتھ۔“ انہوں نے دھکا دے کر اسے صوفے پر گرا دیا، پھر چبا چبا کر بولے۔

”تم میں شرم حیا، لحاظ، مروت کی لہر کئی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم علی الاعلان اس کا اظہار بھی کرو، یا تم اپنے آپ کو بہت اسمارٹ سمجھتی ہو۔“

”میں خود کو کچھ بھی سمجھوں یا کچھ بھی کروں۔ آپ کون ہوتے ہیں مجھے ٹوکنے والے۔“ وہ تنک کر بولی۔

”ابھی تو میں صرف تمہارا غم زاد ہوں اور اس ناتے بھی میں تمہیں ٹوکنے کا حق رکھتا ہوں۔“

”جی نہیں، ایسا کوئی حق نہیں ہے آپ کو۔ اگر رعب جمانے کا اتنا ہی شوق ہے تو سیما، حرا، وغیرہ موجود ہیں۔ ان پر اپنا شوق پورا کر لیں، میں کسی کے رعب میں آنے والی نہیں۔“

وہ برابر سے جواب دے کر انہیں طیش دلارہی تھی لیکن وہ بڑے ضبط سے بولے۔

”جانتا ہوں۔“

”جانتے ہیں تو مجھے یہاں لے کر کیوں آئے ہیں؟“

”تمہاری بات کا جواب دینے کے لیے تم سے شادی کا فیصلہ میرے دل اور دماغ کا مشترکہ فیصلہ ہے، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟“

”ہا۔۔۔۔۔ اس نے یقیناً ہاں کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ وہ فوراً روک کر کہنے لگے۔

”ایک منٹ، ابھی نہیں۔ اچھی طرح سوچ کر جواب دینا۔ ناؤ گیٹ لاسٹ!“

سکین۔ پھر وہ بھی بیٹے سے جائیں۔

پھر عدت کے دن تمام ہونے پر جب امی کے والدین انہیں لینے آئے تو دادا کے لیے یہ ایک اور آزمائش تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے بیٹے کی نشانی ان سے دور ہو لیکن حقیقت پسند انسان تھے۔ امی کی عمر کو دیکھتے ہوئے انہوں نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت اگر ان کا اپنا کوئی بیٹا غیر شادی شدہ ہوتا تو وہ اس کو اس سے عقد ثانی پر مجبور کرتے لیکن کوئی نہیں تھا۔ اور وہ جانتے تھے کہ ان کے والدین انہیں زیادہ عرصہ تک بٹھائے نہیں رکھیں گے۔ اس لیے اسی وقت انہوں نے ان سے درخواست کی تھی کہ کوئی دوسرا شخص اگر خوشی سے نومیہ کو قبول کرے تو ٹھیک، ورنہ بچی کو انہیں دے دیا جائے۔

پھر امی تقریباً ایک سال اپنے میکے میں رہیں۔ اس دوران ان کے والدین نے ان پر دوسری شادی کے لیے بہت زور دیا، مجبور کیا اور جب زبردستی کرنے لگے تو امی نومیہ کو لے کر پھر دادا کے پاس آ گئیں۔ اپنی مرضی سے آئی تھیں اور یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا کہ ساری زندگی اس گھر کی نوکری کریں گی لیکن دوسری شادی نہیں کریں گی۔ اور نوکری کیوں نہ کرتیں، دادا نے بیٹے سے وفاداری نبھانے پر نہ صرف بہو اور پوتی کو اپنی پناہوں میں لیا بلکہ جو تھوڑی بہت جائیداد بنائی تھی، اسے تقسیم کر کے مرحوم بیٹے کا حصہ اسی وقت بہو کے نام کر دیا تاکہ وہ کسی کی محتاج نہ رہیں۔

گو کہ اس وقت امی کی عمر زیادہ نہیں تھی، نہ ہی وہ سمجھ بوجھ رکھنے والی خاتون تھیں۔ بس بعض اوقات انسان کم عمری اور ناتجربگی میں بھی بڑے فیصلے کر لیتا ہے اور پھر باقی ساری زندگی اپنے فیصلے پر قائم رہنے کی کوشش میں گزر جاتی ہے۔ اگر اگلے تین چار سالوں میں یا دادا کے بعد امی کو احساس ہوا بھی تو انہوں نے خود کو مجبور و بے بس پایا کیونکہ پیچھے سب کشتیاں جلا چکی تھیں۔ اور آگے کوئی راستہ نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو یہ خیال کہ کہیں کوئی یہ نہ کہہ دے کہ محض جائیداد میں حصے کی خاطر آئیں اور دادا کی آنکھ بند ہوتے ہی چل دیں۔ گو کہ اس میں رتی برابر صداقت نہیں تھی لیکن کہنے والے یہی کہتے اور وہ کسی کو روک نہیں سکتی تھیں، سیدھی سادی خاتون تھیں۔

”اس کے نہ سمجھنے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔“ وہ ایسے ہی غصے سے سر جھٹک

کر بولی۔

”آخر تم اس سے کس بات کا بدلہ لے رہی ہو؟“

”میں اس سے بدلہ نہیں لے رہی، غلط سمجھتی ہیں آپ!“ وہ پھٹ پڑی۔ ”میں اس کی ماں ہوں، مجھ سے زیادہ کون پیار کر سکتا ہے اس سے لیکن میں اسے اپنا محتاج نہیں بنانا چاہتی۔ جیسے آپ نے مجھے بنایا۔ زندگی میں کہیں اونچ نیچ آئی، آپ میرے سامنے ڈھال بن گئیں۔ زمانے کے سرد و گرم کی کبھی مجھے ہوا تک نہیں لگنے دی۔ نتیجہ آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔ مانتے پر طلاق کا لیبل سجائے اور میں اس کے ساتھ ایسا نہیں چاہتی۔“

امی ششدر اسے دیکھ رہی تھیں۔ جب وہ خاموش ہوئی تو نظریں چراتی ہوئی بولیں۔

”سال بھر کی بچی کو پتہ نہیں تم کیا سکھانا چاہتی ہو!“

”اسی وقت سے دیکھ گئی کہ راستوں کے کانٹے اسے خود چننے ہیں۔ کوئی دوسرا اگر اس

کے لیے اپنے ہاتھ زخمی کرے گا تب بھی چہچہاں اس کی روح میں اترے گی۔“

وہ اپنی بات کہہ کر کمرے سے نکل گئی اور امی نے اچانک بھڑانے والی آنکھوں کو بند کر کے پیشانی ننھی سامعہ کے سر پر ٹکا دی۔

☆☆☆

کچھ لوگوں کو نصیب بھی ورثے میں ملتے ہیں۔ امی اور اس کے نصیب میں فرق صرف اتنا تھا کہ امی جب اس کی عمر کی تھیں تو ان کے نصیب نے انہیں بیوگی کی چادر اوڑھادی تھی۔ اس وقت وہ صرف ایک سال کی تھی۔ ابھی باپ کی شفیق آغوش میں ہسٹنا سیکھ رہی تھی کہ بس اچانک ہی دماغ کی نہیں پھٹ جانے سے ابوکا انتقال ہو گیا، امی کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اتنا چاہنے والا شوہر یوں اچانک داغ مفارقت دے گیا کہ وہ مہینوں اس سانچے سے سنبھل نہیں سکی تھیں۔ اس وقت دادا دادی، حیات تھے۔ جوان بیٹے کی موت کا صدمہ ایسا تھا کہ دادی بمشکل دو مہینے خود کو گھسیٹ

کر ہی نومیہ کا رشتہ طے کیا تھا۔ ظاہر ہے یتیم بھتیجی سے انہیں کیا پر خاش ہو سکتی تھی آگے اس کی قسمت!

اور پتہ نہیں قسمت تھی کہ سرال آتے ہی اسے لگا تھا جیسے پندرہ سولہ سال اپنی نرم گرم آغوش میں دبائے رکھنے کے بعد اب ایک دم سے امی نے اسے تپتی دھوپ میں دھکیل دیا ہوا اور اسے چیخا، احتجاج کرنا بھی نہیں سکھایا گیا تھا۔ پھر جو دبتا ہے اس کو دباتی ہے دنیا۔ سرال میں چھوٹے بڑے سب اس پر حاوی ہو گئے۔ شوہر مٹی کا مادھو! زن مریدی کے طعنے سے بچنے کے لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

ایک سال تک سارے ظلم و ستم اس نے بہت خاموشی سے سہے۔ پھر اسے خود ہی احساس ہوا کہ اس طرح زندگی نہیں گزرے گی۔ کچھ اپنے اندر ہمت پیدا کی اور سامعہ کی پیدائش پر اس نے سوچا کہ اب واقعی وہ مضبوط ہو گئی ہے لیکن جو لوگ اپنے ہر حکم پر اس کا سر جھکا ہوا دیکھنے کے عادی تھے ان سے اس کا نظریں اٹھا کر بات کرنا برداشت نہیں ہوا۔ بیٹی کی پیدائش پر جہاں اسے اپنی مضبوطی کا احساس ہوا، انہوں نے اسے جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکا۔ پہلے بے اولادی کے طعنے تھے، پھر بیٹی پیدا کرنے کے جرم میں نکال باہر کیا۔

بڑے ابا تو پہلے ہی اس کی شادی کرنے کے حق میں نہیں تھے، پھر بھی انہوں نے مصالحت کی کوشش کی لیکن ان کی ایک شرط تھی کہ اب وہ سرال میں نہیں رہے گی۔ میاں اسے الگ گھر لے کر دے اور یہ کوئی ایسا ناجائز مطالبہ بھی نہیں تھا لیکن اس مطالبے کے جواب میں ادھر سے طلاق نامہ بھیج کر قصہ ہی ختم کر دیا گیا اور اس میں قصور کس کا تھا۔ اگر واقعی قسمت خراب تھی، تب بھی اس نے الزام امی کو دیا۔

”اچھا ہوا! آپ نے اپنی زندگی میں ہی سب دیکھ لیا۔ میری شادی سے بربادی

تک۔“

بہر حال اب وہ پہلے والی نومیہ نہیں رہی تھی۔ ماما کی آغوش سے نکل کر وہ صرف دو

بہر حال دادا کے بعد جیٹھوں نے اپنے طور پر ان کا کافی خیال رکھا اور جھٹانیوں کو انہوں نے خود کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ان کی کل کائنات نومیہ تھی۔ اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دی۔ باقی نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ البتہ سر پر سائبان نہ ہونے کی وجہ سے خود کو بہت کمزور محسوس کرتی تھیں اور اندر سے ڈری ہوئی بھی رہتی تھیں۔ ہر وقت یہ خیال کہ ان کی کوئی بات کسی کو بری نہ لگے۔ اگر جھٹانیوں میں سے کوئی اپنے ہی کسی بچے پر خفا ہو رہی ہوتی تو یہ اپنی جگہ مبہم کر نومیہ کو آغوش میں چھپا لیتیں۔ اور چھوٹی سی بچی کو بھی انہوں نے سہا کر رکھ دیا تھا۔ یہ نہ کرو، وہ نہ کرو۔

دوسرے بچے ذرا سی زیادتی پر حلق پھاڑ کر چیختے اور نومیہ کی آواز کو وہ اسے اپنے سینے میں بھینچ کر روک دیتیں۔ نتیجتاً وہ ان سے بھی زیادہ بزدل نکلی۔ اس کے مقابلے میں سمیرا، حرا، سیما وغیرہ کافی تیز تھیں۔ حالانکہ بڑے ابا اور چھوٹے ابا خصوصاً لڑکیوں کے معاملے میں کافی سخت تھے۔ لیکن ان کی ماؤں نے کچھ توازن رکھا ہوا تھا۔ بچوں کی شرارتوں اور بدتمیزیوں پر بجائے پردہ ڈالنے کے بڑے آرام سے کہہ دیتیں کہ کیا ہوا، بچے ہی تو ہیں۔ جبکہ اس کی ہر بات امی اپنے سر لے لیتیں۔ اور یہ اس پر ظلم تھا کہ پھر اسے ہر بات پر امی کی طرف دیکھنے کی عادت ہو گئی۔

اور پھر زندگی کے اس موڑ پر جب امی ساتھ نہیں تھیں۔ وہ اچانک کتنی تنہا ہو گئی۔ وہ بھی اتنی ہی عمر میں، ابھی میٹرک کر کے ہی تو نکلی تھی کہ امی کو معمولی بخار کے بعد یہ وہم ہو گیا جیسے اب وہ زندہ نہیں رہیں گی۔ بس ہر دم اسی کی فکر اور یہ کہ ایک ہی بیٹی ہے۔ اس کی خوشی دیکھ لیں۔ بڑے ابا اور چھوٹے ابا نے امی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ رور و درنٹیں کرتیں کہ میری زندگی میں نومیہ کی شادی ہو جائے۔ اس وقت گھر کا کوئی لڑکا اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہوا تھا۔ سب سے بڑے غزنوی ایم بی اے کے لیے باہر جا رہے تھے۔ اور ان کی نظروں میں تو نومیہ کی شادی سزا سر حماقت تھی لیکن وہی بات کہ وہم کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ امی کی منتوں، گریہ و زاریوں سے مجبور ہو کر بڑے ابا نے ان کی بات مان لی اور پھر ایسے طور پر تو انہوں نے دیکھ بھال

اس کا خیال آتا تو پھر وہ کتنی دیر تک اس کے لیے کڑھتے رہتے کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ یہ اس کی بے فکری کے دن تھے اور وہ اتنی فکروں میں گھر گئی ہوگی۔ انہیں اس سے ہمدردی محسوس ہوتی اور یہاں آکر ساری ہمدردی غصے میں بدل گئی تھی۔ خصوصاً جب وہ انہیں نام لے کر پکارتی تو ان کا دماغ گھوم جاتا، کیونکہ گھر میں سب سے بڑے ہونے کے باعث انہیں شروع ہی سے ایک مقام حاصل تھا اور ترتیب کے حساب سے وہ سب سے آخری نمبر پر تھی۔ یعنی سب سے چھوٹی اور جب انہوں نے عمروں کا فرق جتنا کر لیا تو وہ دھڑلے سے بولی تھی۔

”عمروں کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا، میں بچی کی ماں ہوں اور آپ کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔“

”گویا ماں ہونے کا زعم ہے؟“ انہوں نے سر تاپا اسے دیکھا تھا، ویسی ہی دہلی چلی اسٹارٹ سی۔

”کیوں نہ ہو، ہر ایک کے حصے میں تھوڑی آتا ہے یہ زعم۔“

”وقت آنے پر سب کے حصے میں آتا ہے لیکن تمہاری طرح کوئی آپ سے باہر نہیں ہوتا۔“

جاتا۔

”وقت آنے پر ناں اور مجھے کیونکہ وقت سے پہلے حاصل ہو گیا ہے، اس لیے۔“

”شٹ آپ!“ وہ اس کے برابر سے جواب دینے پر سختی سے ٹوک کر بولے تھے۔ ”میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بس اتنا سن لو کہ آئندہ مجھ سے بات کرتے وقت کسی زعم کے بجائے میری اور اپنی عمر کے فرق کو ذہن میں رکھنا۔“

”مشکل ہے۔“ وہ کہہ کر فوراً ان کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ پھر غرنوی نے خود ہی

اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ شاید اپنی بڑائی اور عزت قائم رکھنے کا یہی طریقہ ان کی سمجھ میں آیا تھا۔ اسے دیکھ کر یوں نظر انداز کر جاتے جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو اور اسے ہرگز پروا نہیں تھی لیکن کسی کسی وقت محض انہیں چھیڑنے کی خاطر کوئی ایسی بات کہہ جاتی جس سے وہ تملتا جاتے تھے۔ غصہ

سال حالات کی بھٹی میں جھلسی تھی اور ان دو سالوں نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ اپنے ساتھ ہونے والے سانحے کا اسے دکھ تو تھا لیکن زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ سب کچھ بہت جلدی اس پر بیت گیا تھا۔

اس کے ساتھ کی حرا اب تھرڈ ایئر میں تھی جب کہ سمیرا اور سیمابی اسے فائل کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھیں۔ کیسی بے فکری کی زندگی تھی ان کی۔ انہیں دیکھ کر اس کا یہ احساس شدید ہو جاتا کہ اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ اپنی زندگی تو وہ جی ہی نہیں پائی اور اس کی زندگی بس اتنی ہی تھی۔ اب تو اسے سامعہ کے لیے جینا تھا، اور سامعہ کے لیے نہ تو وہ امی جیسی بنے گی اور نہ اسے اپنے جیسا بننے دے گی۔ اس سوچ کے ساتھ کسی کسی وقت وہ اس ننھی سی جان سے بڑی زیادتی کر جاتی تھی، جس پر حرا نے اسے ظالم ماں کا خطاب دے رکھا تھا۔

سیمابا کہنا تھا کہ وہ شوہر کی بے وفائی اور سسرال والوں کی زیادتیوں کا بدلہ اس سے لے رہی ہے اور سمیرا تو سرے سے سامعہ کو اس کی بچی ماننے سے ہی انکاری تھی۔ جب کہ لڑکے ابھی تک اسی کی ذات میں الجھے ہوئے تھے بلکہ باقاعدہ ریسرچ کر رہے تھے کہ وہ ایک دم سے کیسے بدل گئی ہے۔ کہاں تو ذرا ذرا سی بات پر چونکتی اور سہم جاتی تھی۔ اور اب یہ عالم ہے کہ کسی کا کوئی لحاظ ہی نہیں۔ یہاں تک کہ جس روز غرنوی ایم بی اے کر کے لوٹے تو سب کے درمیان اس نے انہیں بھی نہیں بخشا تھا۔

”ارے! آپ تو چھڑے چھانٹ واپس آ گئے۔ لگتا ہے کسی میم نے لفٹ ہی نہیں کرائی۔“ اور غرنوی کے بری طرح گھورنے پر بولی تھی۔

”دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے، یہاں بہت لفٹ ملے گی۔“

اور غرنوی کی خطوط کے ذریعے اس کے حالات سے آگاہی تو تھی لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ حالات اس پر کس طرح اثر انداز ہوئے ہیں بلکہ ان کا خیال تھا کہ وہ جو پہلے ہی کمزور اور بزدل قسم کی لڑکی تھی اب تو ایک دم ہی ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی ہوگی۔ حقیقتاً دیا ر غیر میں جب کبھی انہیں

گیا ہے۔“

حرا نے کہا تو سمیرا اچھل پڑی۔ اسے اپنے بھائی کے لیے یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔ چیخ کر بولی۔

”نومیہ کا اپنا دماغ خراب ہے۔“ اتفاق سے وہ سنتی ہوئی آگئی اور بجائے برامانے کے ڈھٹائی سے بولی۔

”کیا ابھی بھی میرا دماغ خراب نہیں ہوگا، یعنی مجھ سے بڑے سب کنوارے بیٹھے ہیں اور میری دوسری شادی کی بات ہو رہی ہے۔ واہ کیا قسمت ہے میری!“

”یہاں مذاق نہیں ہو رہا۔“ سیمانے انتہائی سنجیدگی سے اسے ٹوکا تو اس نے پہلے ایک ایک کی شکل دیکھی۔ پھر کہنے لگی۔

”تم لوگ تو واقعی سنجیدہ ہو۔ مسئلہ کیا ہے مجھے بتاؤ!“

”مذاق میں نہیں اڑانا اور سچ بتاؤ۔ پرسوں جب غزنوی بھائی تمہیں گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے میں لے گئے تھے تو انہوں نے کہا کیا تھا تم سے۔“

سیمانے اسے یاد دلاتے ہوئے پوچھا تو وہ غزنوی کے لہجے کی نقل اتارتی ہوئی بولی۔

”کہہ رہے تھے۔ تم سے شادی کا فیصلہ میرے دل اور دماغ کا مشترکہ فیصلہ ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے کیا؟“

”پھر تم نے کیا کہا؟“ حرا کی بے صبری پر وہ لا پرواہی سے بولی

”یہی کہ میں ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گی۔“

”پھر تو واقعی تمہارا دماغ خراب ہے۔ اتنے اچھے پر پوزل کو.....“

”باس!“ اس نے چیخ کر حرا کو خاموش کر دیا۔ پھر کہنے لگی۔ ”غزنوی میرے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ انہیں میں بھی اتنا ہی جانتی ہوں جتنا کہ تم سب، یعنی ان کی تمام خوبیوں سے واقف ہوں۔ اس کے باوجود شادی نہیں کروں گی۔“

ان کی آنکھوں سے چھلکنے لگتا اور جیسے بس نہیں چلتا تھا کہ اس کی گردن دبا دیں۔ گھر میں سب ہی جانتے تھے کہ وہ اس سے کتنی خار کھاتے ہیں، جیسی تو ان کے شادی کے فیصلے نے سب کو حیران کر دیا تھا۔

☆☆☆

پھر اگلے دو دن لڑکیوں کے پاس اور کوئی موضوع ہی نہیں تھا اور اس ایک موضوع پر ہر پہلو سے اظہار خیال ہو رہا تھا۔ ساتھ ساتھ الجھ بھی رہی تھیں۔ ایک معمہ تھا یا ابھی ڈور جس کا سرا ڈھونڈنے میں لگی ہوئی تھیں۔

”غزنوی بھائی جذباتی تو ہو نہیں سکتے۔“ سیمانے کے خیال سے فوراً اتفاق کیا گیا۔

”اور نہ ہی وہ طوفانی عشق میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک!“

”میرا خیال ہے انہیں نومیہ سے ہمدردی ہو گئی ہے اور وہ اس کے دکھ سمیٹنا چاہتے ہیں۔“

حرا نے اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے سیمانے اور سمیرا کو یوں دیکھا جیسے وہ اس سے اتفاق کریں گی۔

”دکھ!“ وہ دونوں ہنسیں۔ ”بے وقوف لڑکی! تمہیں نومیہ کہاں سے دکھی نظر آتی ہے؟“

”نظر نہیں آتی تو اس کا یہ منسلب تو نہیں ہے کہ اسے اپنے ساتھ ہونے والے ایسے کا دکھ ہی نہیں ہوگا۔“

”یہ تو ہے۔“ سمیرا نے اتفاق کر لیا پھر کہنے لگی۔ ”لیکن غزنوی بھائی کو اس کے اندر جھانکنے کی فرصت کہاں ہے۔“

”اور کیا! وہ تو اس سے بات بھی نہیں کرتے بلکہ دیکھتے ہی کترا کر نکل جاتے ہیں۔“

”پھر ہمیں نومیہ کی بات سے اتفاق کر لینا چاہیے کہ غزنوی بھائی کا کوئی اسکرودھیلا ہو“

”بہت واضح کہ آپ مجھ سے شادی سے باز آ جائیں۔“

یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں، لیکن آخر کیوں؟ کیوں شادی نہیں کرنا چاہتیں تم۔ پہلی شادی

کی ناکامی سے خوفزدہ ہو یا.....“

”میں کسی بات سے خوفزدہ نہیں ہوں۔“ وہ فوراً بول پڑی۔

”پھر.....؟“ وہ مجسم سوالیہ نشان بن گئے جس سے وہ چڑ کر بولی۔

”پھر کیا، بس مجھے نہیں کرنی شادی۔“

”وہی تو میں پوچھ رہا ہوں کیوں؟ دیکھو! جب تک تم ٹھوس وجہ نہیں بتاؤ گی، تمہاری کوئی

بات نہیں سنی جائے گی۔“

آخر میں انہوں نے نرم لہجہ اختیار کر کے اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔

”اچھی زبردستی ہے۔“

”زبردستی کی بات نہیں ہے نومیہ! تم سمجھنے کی کوشش کرو۔ چچی جان تمہاری ہی عمر

میں بیوہ ہوئی تھیں۔ اس کے بعد ان کا دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ صحیح تھا یا غلط..... یہ میں نہیں

جانتا۔ لیکن یہ یقین سے کہوں گا کہ تم ان کی طرح زندگی نہیں گزار سکتیں۔“

”کیوں؟“ وہ پیشانی پر بے شمار شکنیں ڈال کر بولی۔

”اس لیے کہ زمانہ بدل گیا ہے۔ محبتیں، رواداریاں سب وقت اپنے ساتھ بہائے

لیے جا رہا ہے۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے جب چچی جان تمہاری انگلی تھام کر دوبارہ اس گھر میں

داخل ہوئی تھیں تو انہیں یقین تھا کہ یہاں تمہیں باپ نہیں تو باپ جیسی شفقتیں ضرور ملیں گی۔ اور یہ

تم جانتی ہو کہ ان کے یقین کو کہیں ٹھیس نہیں پہنچی۔ کیا تمہارے پاس ایسا کوئی یقین ہے؟“

انہوں نے اچانک اسے سامعہ کا احساس دلایا اور ابھی وہ جواب نہیں دے پائی تھی کہ

کہنے لگے۔

”میں سامعہ کے دودھیال کی نہیں، یہاں کی بات کر رہا ہوں۔ یہاں بھی کوئی نہیں

”کیوں؟“ تینوں ایک ساتھ بولیں۔ خاصا جارحانہ انداز تھا۔

”زبردستی ہے کیا؟ بس نہیں کروں گی..... میری مرضی!“ وہ بھی تنگ کر بولی تھی۔

اور اب ظاہر ہے اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ غرنوی اپنا فیصلہ سنا چکے

تھے۔ اور بڑے ابا نے امی سے بھی بات کر لی تھی۔ ظاہر ہے امی کو اور کیا چاہیے تھا۔ گھر کا لڑکا وہ بھی

لائق فائق۔ انہوں نے بخوشی اس کا اختیار بڑے ابا کو سونپ دیا۔ پہلے بھی انہوں نے اس سے نہیں

پوچھا تھا اور اب بھی شاید ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اب وہ پہلے والی نومیہ نہیں تھی کہ خاموشی سے

سر جھکا دیتی۔ بس کچھ دن خاموشی سے دیکھتی رہی کیونکہ ان دنوں سمیرا کی کہیں بات چل رہی تھی اور

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس دوران کوئی ہنگامہ کھڑا کرے۔ البتہ سمیرا کی بات طے ہو جانے کے بعد

جب اس نے سنا کہ بڑے ابا کا ارادہ دونوں شادیاں ایک ساتھ کرنے کا ہے۔ تب پہلے اس نے

امی کے سامنے زبان کھولی کہ وہ بڑے ابا کو صاف انکار کر دیں لیکن امی نے صاف اپنا دامن بچا

لیا۔

”میں کیسے انکار کر سکتی ہوں اور وہ میری مانیں گے کب۔ ان کے لیے جیسے سمیرا ہے

ویسے تم۔ کبھی کوئی فرق رکھا انہوں نے؟ پھر میں کیسے تم پر صرف اپنا حق جتا سکتی ہوں۔“

وہ سمجھ گئی۔ امی سے مزید کچھ کہنا فضول ہے اور براہ راست بڑے ابا سے کہنا بہت مشکل

تھا۔ آتے جاتے غرنوی کو سنا کر کہنے لگی۔

”ضرور ان لوگوں میں کوئی خامی ہوتی ہے جو اچھی لڑکیوں کو چھوڑ کر طلاق یافتہ سے

شادی کرتے ہیں۔“

دو دن غرنوی اس کی بکواس سن کر نظر انداز کرتے رہے اور جب ان کی برداشت کی حد

ختم ہو گئی تب پھر اسے گھسیٹے ہوئے لے آئے۔

”آخر ان باتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟“ انہوں نے جتنے غصے سے پوچھا وہ اتنے

ہی آرام سے بولی۔

کر دیا۔ اس کے خیال میں وہ محض ضد پر اتر آئے تھے۔ اور ان کی ضد کو توڑنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔ اگر وقت ہوتا تو وہ اسی مشکل کام میں لگ جاتی۔ لیکن یہاں تو بڑی اماں شادی کی تاریخ پر بات کر رہی تھیں۔ اس لیے غزنوی سے الجھنے میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اس رات وہ اپنی ساری ہمتیں یکجا کر کے بڑے ابا کے پاس چلی آئی۔

”کیا بات ہے؟“ بڑے ابا کو یقین تھا کہ وہ کسی کام سے ہی آئی ہوگی۔ پوچھنے کے ساتھ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ سر جھکا کر بولی۔

”وہ بڑے ابا! مجھے آپ سے ایک بات کہنی تھی۔“

”ہاں کہو!“ ان کا لہجہ ہمیشہ نرم ہوتا تھا۔ اس کے باوجود جانے کی سارعب تھا کہ ہونٹوں تک آئی بات بھول جاتی تھی اور یہ صرف اسی کے ساتھ نہیں تھا۔ گھر کا ہر فرد ان کے سامنے آکر اسی طرح پزل ہو جاتا تھا۔ وہ بہت سوچ کر آئی تھی پھر بھی کہنے میں بہت وقت لگا۔

”میں..... میں..... شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

”پھر.....؟“ اچھا ہوا انہوں نے کیوں کا سوال نہیں اٹھایا اور اسے بروقت جواب سوچ گیا۔

”میں پڑھنا چاہتی ہوں۔“ اس کے بعد اسے انتظار کرنا پڑا کیونکہ بڑے ابا ایک دم خاموش ہو گئے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ذرا سی پلکیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھے۔ پھر اپنے آپ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”اچھی بات ہے، ضرور پڑھو۔ کم از کم گھر کی دوسری لڑکیوں کی طرح گریجویشن تو کر ہی لو۔“

”سچ بڑے ابا!“ وہ بے اختیار خوشی کا اظہار کر گئی۔ ”میں کالج میں ایڈمشن لے لوں تو آپ میری شادی نہیں کریں گے نا!“

”پہلے یہ بتاؤ کہ تم واقعی پڑھنا چاہتی ہو یا شادی نہ کرنے کا بہانا ہے۔“

ہے، سب اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف ہو جائیں گے۔ پھر تم سامعہ کی زندگی کے اس خلاء کو کیسے پرکرو گی؟“

”اس کا باپ زندہ ہے غزنوی! اور جیتے جی باپ نے اسے جس شفقت سے محروم کر دیا۔ وہ کوئی دوسرا بھی اسے نہیں دے سکتا۔“

اس کے ناگوار سے سخت لہجے پر وہ رُک کر بولے۔

”میں جو دینا چاہتا ہوں۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ.....“ وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگے۔ جس طرح براہ راست ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال لے کھڑی تھی۔ اس سے وہ سمجھ گئے کہ اس وقت اسے سمجھانے اور احساس دلانے کی ان کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہیں ہوگی جب ہی بات ختم کرتے ہوئے بولے۔

”اور میں آپ سے یہ کہوں گی کہ آپ کو سامعہ کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ ان ہی کے لہجے میں کہہ کر ان کے کمرے سے نکل آئی اور یہ سوچا کہ اب یہ قصہ ختم ہو گیا اور واقعی بات ختم ہو جانی چاہیے تھی لیکن غزنوی جانے کیا سوچے ہوئے تھے کہ اس کے صاف انکار کے باوجود بھی اپنا فیصلہ واپس نہیں لیا بلکہ یوں اطمینان سے تھے جیسے اس کے انکار کی کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔

☆☆☆

دو روز بعد اس نے اتفاق سے امی اور بڑی اماں کو باتیں کرتے سن لیا جس سے اسے پتہ چلا کہ غزنوی نے شادی سے منع نہیں کیا۔ حقیقتاً وہ بری طرح تلملا گئی۔ اس وقت غزنوی گھر پر موجود نہیں تھے اور یہ بھی اچھا ہی ہوا اور نہ وہ اسی وقت غصے میں الٹا سیدھا بک کر چلی آتی۔

بہر حال شام تک اس کا غصہ کم ہوا تو اس نے غزنوی سے بات کرنے کا ارادہ ہی ترک

لی تھی جبکہ حرا غزنوی سے چھوٹے تیور کو پسند کرتی تھی۔ تیور بھی اس کی طرف مائل تھا اور یہ بات کسی سے چھپی نہیں تھی۔ اس لیے غزنوی کی فوری شادی ممکن نہیں ہو سکی۔ اب سمیرا کی شادی کے بعد ہی بڑی اماں اطمینان سے ان کے لیے لڑکی دیکھ سکتی تھیں۔

بہر حال اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا یعنی وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ لاکھ کہے کہ وہ پہلی شادی اور اس کی ناکامی سے خوفزدہ نہیں ہے لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ اندر سے خوفزدہ تھی۔ اس کے ساتھ اچھا بھی تو نہیں ہوا تھا۔ ایک تو کم عمری میں شادی، پھر سسرال والوں کا انتہائی ظالمانہ سلوک! اگر شوہر ہی محبت کرنے والا ہوتا، تب شاید اس کی ڈھارس بندھی رہتی اور محبت میں تو بہت کچھ جھیلا جاسکتا ہے لیکن محبت تو تھی ہی نہیں جی تو اس کی خاموشیوں اور خدمت گزار یوں کا صلہ طلاق کی صورت میں ملا۔ اور یقیناً بڑے ابا کو احساس تھا، جب ہی تو بلا چون و چرا اس کی بات مان گئے تھے۔ بعد میں امی سے کہنے لگے۔

”ابھی بچی ہے، سہی ہوئی بھی ہے۔ اس لیے مجھے مناسب نہیں لگا کہ پھر اس پر اتنی ذمہ داریاں ڈال دوں۔ کچھ وقت گزرنے دو پھر سوچیں گے۔ یوں بھی غزنوی کے ساتھ اس کا جوڑ نہیں بنتا، بہت چھوٹی ہے اس سے۔“

”اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے۔“ یہاں امی کو اختلاف ہوا۔

”خیر! تم فکر نہیں کرو۔ وہ میری ذمہ داری ہے اور میں اب جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں

کروں گا۔“

بڑے ابا نے امی کو اطمینان دلایا اور وہ اطمینان سے ہو کر بھی اس کی فکر سے آزاد نہیں ہو سکیں بلکہ پہلے سے زیادہ فکر مند ہو گئیں اور یہ فطری سی بات تھی۔

☆☆☆

پھر کچھ دنوں میں سمیرا کی شادی کا ہنگامہ شروع ہوا تو آپ ہی آپ اس کی طرف سے سب کا دھیان ہٹ گیا۔ اور وہ دو سال سسرال میں اور کچھ نہیں تو گھر داری تو سیکھ ہی گئی تھی۔ جب

بڑے ابا نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا تو وہ ہٹائی ضرور لیکن جلدی سے بولی۔

”پڑھنا چاہتی ہوں۔ میرا مطلب ہے واقعی.....“

”شادی کے بعد بھی تو پڑھ سکتی ہو۔“ بڑے ابا نے کہہ کر پھر فوراً ہی اپنی بات کی نفی کر دی۔

”نہیں میرا خیال ہے مشکل ہے۔ خیر اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو میں رد نہیں کر سکتا۔“

”شکریہ بڑے ابا! میں جاؤں؟“

”ہوں۔ اور ذرا غزنوی کو میرے پاس بھیج دو۔“

”جی بہتر۔“ ان کے کمرے سے نکلنے تک وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو رکھ سکی۔ اس

کے بعد میٹرھیاں پھلانکتی ہوئی آئی تھی اور غزنوی کے کمرے میں تو باقاعدہ دندناتی ہوئی داخل ہوئی۔

”بڑے آئے مجھ سے شادی کرنے والے! جائیے آپ کو بڑے ابا بلار ہے ہیں۔“

”خیریت؟“ انہوں نے سر تاپا اسے دیکھا تو گردن اکڑا کر بولی۔

”اپنے ہاں تو سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے میں تو نیک چاہتی

ہوں لیکن میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔“

”کیوں نہیں ہوتا۔ سارا دار و مدار ہی تمہارے چاہنے پر ہے۔“ وہ کہتے ہوئے کمرے

سے نکل گئے۔

☆☆☆

پتہ نہیں بڑے ابا نے غزنوی سے اور سب گھر والوں سے کیا کہا کہ اس پر کوئی بات نہیں

آئی تھی۔ یعنی سب یہی سمجھ رہے تھے کہ بڑے ابا نے فی الحال اس کی شادی ملتوی کر دی ہے۔ وہ

گریجویشن کر لے تب سوچیں گے۔ اور غزنوی کے لیے انہوں نے بڑی اماں سے کہہ دیا کہ وہ ان

کے لیے کوئی اور لڑکی تلاش کر لیں۔ گو کہ اس گھر میں سیما اور حرا بھی تھیں لیکن دونوں ہی ایک طرح

سے منسوب، یعنی سیما کے لیے اس کے ماموں دامن پھیلا چکے تھے اور چھوٹے ابا نے ہامی بھی بھر

”تم نے سیکھ لیا؟“ وہ چڑ کر بولے۔

”ایسا ویسا! اگر میری جگہ آپ ہوتے تو آپ بھی سب سیکھ جاتے۔“ اس کا اشارہ

سسرال کی طرف تھا۔ وہ سمجھ کر قصداً انجان بن گئے۔

”چلو بچی کو اندر لے چلو!“

”امی موجود نہیں ہیں اور یہ کسی اور کے پاس جا نہیں رہی۔ آپ بلا کر دیکھیں۔“

وہ کہتی ہوئی ان کے قریب آئی۔ پھر سامعہ کو ان کی طرف متوجہ کر کے بولی۔

”جاؤ بیٹا! ماموں کے پاس۔“

اس نے بے ساختہ ماموں نہیں کہا تھا اور جس انداز سے بتایا تھا، وہ بھی اسی طرح جتا

کر بولے۔

”یہ کبھی مجھے ماموں نہیں کہے گی۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ اس کی ماں میرا نام لیتی ہے۔ مجھے غزنوی بھائی نہیں کہتی۔ اور اب کہنا

بھی مت کیونکہ میں تمہیں پروپوز کر چکا ہوں۔“

وہ اپنی بات کہہ کر فوراً کچن سے نکل گئے اور اس وقت وہ جھنجھلا کر رہ گئی لیکن بعد میں

جب موقع ملا، انہیں چھیڑنے سے باز نہیں آئی۔ دیکھتے ہی سامعہ کو ماموں سکھانا شروع کر دیتی۔

”پہلے اسے اماں کہنا تو سکھاؤ۔“ اصل بات سے بے خبر اس وقت حرا نے اسے ٹوک دیا

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی۔ غزنوی بول پڑے۔

”اسے اپنے آپ کو ماما کہلوانے کا زیادہ شوق ہے۔“

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ ایک دم سامعہ کو چھوڑ کر ان کی طرف گھوم کر چیخی۔

”جو بھی سمجھ لو.....“ انہوں نے کندھے اچکائے اور فوراً آگے بڑھ گئے تو حرا کی ہنسی کی

آواز پر وہ اس کی طرف پلٹ کر بولی۔

ہی پوری شادی میں کچن کا نظام اس نے بہت احسن طریقے سے سنبھالے رکھا۔ وقت بے وقت مہمانوں کی آمد پر چائے کھانا، کسی کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ بڑی اماں، چھوٹی اماں اور امی یعنی گھر کی تینوں خواتین تو سارا وقت جہیز کی لسٹ بنانے اور اس کے مطابق سامان گننے میں لگی رہتیں۔ سیما، حرا اپنی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ کسی کسی وقت آ کر اس کا ہاتھ بنا دیتیں ورنہ وہ اکیلی ہی ہوتی تھی۔

اس وقت وہ دوپہر کا کھانا بنانے کھڑی ہوئی تھی کہ ادھر سامعہ نے رونا شروع کر دیا۔ امی کچھ دیر پہلے ہی بڑی اماں کے ساتھ بازار گئی تھیں۔ اس نے وہیں سے حرا کو پکار کر سامعہ کو چپ کرانے کو کہہ دیا لیکن سامعہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ وہ یہی سمجھی اس کے آس پاس کوئی موجود نہیں ہے۔ جلدی سے ہاتھ دھو کر کچن سے نکل کر آئی تو حرا اسے گود میں لیے بہلانے کی کوشش کر رہی تھی، اسے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

”یہ مجھ سے چپ نہیں ہو رہی، شاید اسے بھوک لگی ہے۔“

”ابھی تو فیڈر دی تھی۔“ اس نے جیسے ہی سامعہ کو اپنی گود میں لیا، وہ چپ ہو گئی جس پر

حرا نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ارے! یہ تہاڑی گود میں جاتے ہی چپ کیسے ہو گئی۔“

”میری دہشت سے۔“ وہ ہنستی ہوئی سامعہ کو لیے ہوئے دوبارہ کچن میں

آگئی۔ گوشت میں پانی خشک ہو گیا تھا۔ اس نے چولہا دھیمہ کر کے گھی ڈالا۔ پھر اسی طرح ایک بازو میں سامعہ کو دبائے اور دوسرے ہاتھ میں سالن بھون رہی تھی کہ غزنوی آگئے۔

”چائے!“ وہ غالباً چائے کا کہنے آئے تھے لیکن اس کے پاس سامعہ کو دیکھ کر برہمی

سے بولے۔ ”یہ بچی یہاں کیا کر رہی ہے؟“

”سیکھ رہی ہے۔“ پھر پتیلی ڈھک کر انہیں دیکھتی ہوئی بولی۔ ”میرا مطلب ہے کھانا

پکانا سیکھ رہی ہے۔“

”ان سے تو میں اچھی طرح سمجھ لوں گی۔“

”میرا خیال ہے، غزنوی بھائی تمہارا بہت لحاظ کر رہے ہیں۔ کسی دن سچ سچ تمہیں پیٹ کر رکھ دیں گے۔“ حرا نے اسے متوقع خطرے سے آگاہ کیا تو وہ ہنستی ہوئی بولی تھی۔

”مجھے بھی یہی لگتا ہے۔“

☆☆☆

پھر سمیرا کی شادی کے بعد اس نے حرا کے کالج میں ایڈمشن لے لیا اور اس کے ساتھ جانے آنے لگی تو ایک بار پھر اسے افسوس ہونے لگا۔ کہ اگر امی اس کی شادی کے لیے ضد نہ کرتیں تو اب وہ حرا کے ساتھ بی اے میں ہوتی۔ ابھی بھی کوئی یقین نہیں کرتا تھا کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر آئی ہے۔ بہر حال اب تو صرف شادی سے بچنے کے لیے اس نے یہ راستہ چنا تھا اور ابتداء میں تو جیسے بہت مجبوری کے عالم میں بہت بے دلی سے کالج جاتی تھی۔ اگر بڑے ابا کی طرف سے ذرا سی ڈھیل مل جاتی تو وہ پرائیویٹ امتحان دینے کا کہہ کر اطمینان سے گھر بیٹھ جاتی۔ لیکن یہاں پر ابا نے ذرا بھی رعایت نہیں کی۔ یوں وہ پابند ہو گئی تھی لیکن پھر دھیرے دھیرے اسے اچھا لگنے لگا۔

کچھ وقت کالج اور دوستوں کے درمیان وہ بالکل بھول جاتی کہ اس کی زندگی میں کوئی طوفان آکر جا چکا ہے۔ اس کے برعکس جیسے ابھی سکول سے نکل کر کالج میں آئی ہو۔ وہی روٹین شروع ہو چکی تھی۔ کالج سے آکر کھانا کھاتے ہی سو جاتی۔ شام کا کچھ وقت کزنز کے ساتھ باتوں اور چھیڑ چھاڑ میں گزرتا، پھر رات کا کھانا وہ اور حرا مل کر پکاتی تھیں۔ کھانے کے بعد ٹی وی دیکھنا بھی ضروری تھا کیونکہ کالج میں لڑکیاں ڈراموں پر تبصرہ کرتیں تو وہ خاموش نہیں رہ سکتی تھی۔ پھر دس بجے کتابیں لے کر بیٹھی تو خواہ دل مائل ہو یا نہ ہو اسے دو گھنٹے ضرور پڑھنا ہوتا تھا، یہ اس نے طے کر لیا تھا لیکن سامعہ کے لیے اس نے کوئی وقت طے نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے بچی سے محبت نہیں تھی۔ ظاہر ہے ماں تھی اور اس کے لیے وہی جذبات رکھتی تھی لیکن اپنی زندگی کے تلخ تجربے کے

باعث اپنے جذبات کا اظہار کم ہی کرتی تھی۔ دوسرے سامعہ اس سے زیادہ امی سے مانوس تھی۔ اب تو وہ سوتی بھی انہی کے ساتھ تھی، جب ہی اس کی طرف سے وہ اطمینان سے ہونے کے ساتھ کچھ لا پرواہی ہو گئی تھی۔ البتہ امی کو وہ اس پر حد درجہ محبتیں نچھاور کرنے پر ٹوکتی ضرور تھی۔ اور یہ یقیناً اس کے لاشعور میں چھپا خوف تھا جو وہ اب بھی اپنی مثال دے کر کہتی تھی۔

”جیسا میرے ساتھ کیا اس کے ساتھ نہیں کریں۔ یہیں سے اسے سختی جھیلنے کی عادت ڈالیں۔ کون جانے آگے راستے کتنے دشوار ہوں۔“

سامعہ اب چلنے لگی تھی۔ اس وقت برآمدے کی سیڑھی اترتے ہوئے وہ لڑھک کر نیچے آ رہی۔ وہ سامنے کھڑی دیکھ رہی تھی لیکن بڑھ کر اسے اٹھایا نہیں بلکہ وہیں سے کہنے لگی۔

”اٹھ جاؤ بیٹا! شاباش۔“ روتی ہوئی بچی نے اس کی طرف بازو پھیلا دیے۔ پھر بھی وہ آگے نہیں بڑھی۔ تب ہی غزنوی کمرے سے نکل آئے تو پہلے انہوں نے بے اختیار بچی کو اٹھایا، پھر اسے دیکھ کر کسی قدر سختی سے بولے۔

”حرا تمہیں ظالم ماں ٹھیک کہتی ہے۔“ اس نے بجائے احتجاج کرنے کے لا پرواہی سے کندھے اُچکائے۔ پھر پوچھنے لگی۔

”اور آپ کیا کہتے ہیں؟“

غزنوی بچی کو چپ کرانے میں لگے ہوئے تھے۔ یوں بھی اب وہ اس سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ ابھی بھی ان سنی کر گئے، تب وہ ان کے پاس آکر ایک طرح سے اپنا حق جتا کر بولی۔

”لائیے! میری بیٹی کو مجھے دیں۔“

”تمہاری بیٹی!“ انہوں نے کڑی نظروں سے اسے دیکھا، پھر کہنے لگے۔

”بلا کر دیکھو، اگر یہ تمہارے پاس آگئی تو مان لوں گا کہ یہ صرف تمہاری بیٹی ہے۔“

”چیلنج کر رہے ہیں؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں میں۔ سامعہ کے سامنے تم لوگ مجھے ظالم اور نجانے کیا کیا کہتے ہو۔ اب وہ ڈر سے میرے پاس آتی بھی نہیں۔“

”تمہاری حرکتوں کی وجہ سے نہیں آتی۔“ حرا اس کی بات سے چڑ کر بولی۔
”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”سیدھی سی بات ہے۔ بچے صرف پیار کی زبان سمجھتے ہیں۔“
”میں اس سے پیار نہیں کرتی کیا؟“

”ضرور کرتی ہو لیکن اظہار نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس اپنے سارے تلخ تجربات اسی وقت اسے گھول کر پلا دینا چاہتی ہو اور ٹوکے پر دھڑلے سے کہتی ہو کہ یہ اسی وقت سے سیکھے گی، یعنی ڈیڑھ سال کی بچی کو تم زمانے کی اونچ نیچ سکھانا چاہتی ہو۔ بس کرو میہ! اتنا ظلم مت کرو۔“
حرا کے لہجے میں دکھ کے ساتھ تاسف بھی تھا، پھر کہنے لگی۔

”مجھے افسوس ہوا تمہاری بات پر، سامعہ کو تم سے متنفر کر کے کسی کو کیا ملے گا؟ بتاؤ؟“
حرا کی سوالیہ نظروں کے جواب میں وہ جزبزی ہو کر نظریں چراگئی لیکن اپنی غلطی تسلیم نہیں کی۔

☆☆☆

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ ہو سکتا ہے حرا کی باتوں کو کچھ وقت اس نے سوچا ہو لیکن اس پر اثر کچھ نہیں ہوا۔ شاید اس لیے کہ جو کچھ اس پر بیٹا تھا اس کے نقوش گہرے تھے۔ بھلانا چاہتی بھی تو نہیں بھول سکتی تھی۔ پھر اس کے دماغ میں یہ بات بھی بیٹھ گئی تھی کہ امی نے اسے کچھ نہیں سکھایا تھا۔ اگر زمانے کی اونچ نیچ سکھائی ہوتی، کچھ سختیاں جھیلنے کی عادت ڈالی ہوتی تو وہ حالات سے لڑ سکتی تھی۔ سرال والے یوں اسے نکال باہر نہ کرتے۔ اور اپنی اسی سوچ کے باعث کسی کی کوئی بات ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اور غزنوی کے چیلنج اور ان کے بعد حرا کی باتوں کے بعد سے اب وہ یہ کوشش بھی کرنے لگی تھی کہ سامعہ کو کسی کے پاس نہ جانے دے۔ یعنی اس کے

”ہاں!“ انہوں نے اپنے کندھے سے لگی سامعہ کا چہرہ اس کی طرف موڑا تو وہ فوراً اس کی طرف ہاتھ پھیلا کر بولی۔

”آؤ سامعہ! میرے پاس آؤ میری گڑیا، میری بیٹی، آؤ شاہاش!“

وہ جتنا اسے پکارتی تھی، بچی اسی قدر غزنوی کے گلے میں بازو ڈال کر جیسے ان میں چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک دو بار غزنوی نے بھی بچی سے اس کے پاس جانے کو کہا لیکن وہ ان سے الگ ہونے کو تیار ہی نہیں ہوئی۔ جب کہ وہ لہجے میں زمانے بھر کی مٹھاس اور پیار سو کر بلا رہی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے اس پر جھنجھلاہٹ سوار ہونے لگی۔ اس کے بعد غصہ، بچی کو آنکھیں دکھا کر بولی۔

”میرے پاس آؤ ورنہ.....“

”بس!“ غزنوی نے ہاتھ اٹھا کر اسے ٹوک دیا اور مزید کچھ بتائے بغیر بچی کو لیے ہوئے باہر نکل گئے تو کچھ دیر تک وہ ان کے پیچھے نظریں جمائے کھڑی رہی۔ پھر اپنے آپ دانت پیس کر بڑبڑا رہی تھی۔ کہ حرا کو دیکھ کر فوراً اس سے کہنے لگی۔

”سنو! یہ سب ٹھیک نہیں ہو رہا۔“

”کیا..... کیا ٹھیک نہیں ہو رہا؟“ حرا نے ادھر ادھر دیکھا اور کسی اور کو موجود نہ پا کر نظریں اس پر جمائیں تو وہ اسی طرح غصے سے بولی۔

”سامعہ کو مجھ سے متنفر کیا جا رہا ہے۔“ حرا بے ساختہ ہنس پڑی جس پر وہ مزید تلملا گئی۔
”اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

”واقعی! یہ تو سوچنے کی بات ہے۔ کون متنفر کر رہا ہے اسے تم سے؟“ حرا نے بمشکل ہنسی روک کر پوچھا۔

”تم سب! تم سب اس سازش میں شریک ہو۔“

”کیا کہا؟“

”کیا! وہ چیخ پڑی۔ ”کون لے کر گیا ہے، کس کی اجازت سے.....؟“

”ارے رے۔“ سیما ایک دم شٹنگائی۔ ”میرا یہ مطلب تھوڑی تھا۔“

”پھر کیا مطلب ہے تمہارا۔ بتاؤ سامعہ کہاں ہے؟“

”ابھی غزنوی بھائی اوپر.....“

بات ابھی سیما کے ہونٹوں میں تھی کہ اس نے زینے کی طرف دوڑ لگا دی اور دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اوپر آئی۔ اصل میں وہ سیما کی پہلی بات سے پریشان ہو گئی تھی۔ کہ سامعہ اپنے پاپا کے پاس ہے۔ پتہ نہیں اس نے ایسا مذاق کیوں کیا تھا۔ اس کی بہر حال جان پر بن آئی تھی۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ غزنوی کے کمرے میں داخل ہوئی اور سامعہ کو ان کی گود سے جھپٹ کر اپنے سینے میں زور سے بھینچتی ہوئی گویا اس کے ہونے کا یقین کرنے لگی۔ جب کہ بچی اس کے بازوؤں کے تنگ حلقے میں رونے لگی تھی۔ جب اس نے خود کو یقین دلا کر آنکھیں کھولیں تب غزنوی پوچھنے لگے۔

”کیا بات ہے اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟“ وہ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ روتی ہوئی سامعہ غزنوی کی طرف بازو پھیلا کر بولی۔

”پاپا.....! پاپا.....!“

”پاپا.....“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ اس نے حیران ہو کر سامعہ پھر غزنوی کو دیکھا اور سیما کی بات سمجھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”اسے پاپا کہنا کس نے سکھا دیا؟“

”میں نے، تمہیں کوئی اعتراض ہے کیا؟“

انہوں نے جواب کے ساتھ ہی سوال کر دیا تو وہ سامعہ کو ان کی گود میں ڈالتے ہوئے

بولی۔

”لیکن آپ اس کے پاپا کبھی نہیں بن سکتے۔“ اس کے ساتھ ہی جانے لگی کہ وہ پکار کر

خیال میں اتالا ڈیپارنچی کے لیے نقصان دہ تھا۔ براہ راست تو کسی کو منع نہیں کر سکتی تھی، بس بہانے سے سامعہ کو بلا لیتی لیکن زیادہ دیر تک وہ سامعہ کو اپنے پاس نہیں بٹھا سکتی تھی کیونکہ اس گھر میں ایک وہی چھوٹی بچی تھی۔ اس لیے سب کی توجہ کا مرکز وہی تھی۔ جس وقت جو فارغ ہوتا، سامعہ سامعہ پکارتا چلا آتا۔ یہاں تک کہ بڑے ابا اور چھوٹے ابا بھی گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے سامعہ کو پکارتے تھے اور وہ کس کس کو منع کرتی۔

اس وقت وہ کالج سے لوٹی تھی۔ کھانے کے بعد جب سونے لگی تو سامعہ کو زبردستی اپنے ساتھ لٹا کر تھپک تھپک کرسلانے لگی۔ امی نے دیکھا تو ٹوکتے ہوئے بولیں۔

”کیوں زبردستی سلارہی ہو؟ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو سو کر اٹھی ہے۔ لاؤ مجھے دے دو۔“

”نہیں، سو جائے گی۔“ وہ سامعہ کو اور زور سے تھپکتے ہوئے کہنے لگی۔

”آئندہ اسے بے وقت نہیں سلانا۔ میرے ساتھ سوئے گی اور میرے ساتھ اٹھے

گی۔“

”بچوں کے سونے جانے کا کوئی وقت نہیں ہوتا۔“ امی نے کہتے ہوئے سامعہ کو زبردستی

اس کے پاس سے اٹھا لیا، پھر کمرے سے نکلتے ہوئے بولیں۔ ”تم سوؤ آرام سے!“

”ہونہ آرام سے۔“ اس نے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدل لی۔

پھر شام میں سو کر اٹھی تو امی عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ جیسے ہی انہوں نے سلام

پھیرا، اس نے سامعہ کا پوچھا۔ جس پر امی خفا ہو کر بولیں۔

”یہ تم سامعہ کے لیے اتنی دہی کیوں ہو گئی ہو؟ کوئی اسے تم سے چھین تو نہیں رہا اور

چھین کر جائے گا بھی کہاں۔ سب یہیں رہتے ہیں۔“

”آپ کیا سمجھیں گی۔“ وہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل کر آئی تو برآمدے میں سیما مل

گئی۔ اس نے فوراً اس سے سامعہ کا پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”سامعہ اس وقت اپنے پاپا کے پاس ہے۔“

بولے۔

”سنو! حقائق سے نظریں چرانا بزدلی ہے۔ اپنے ساتھ ساتھ تم اس بچی پر بھی ظلم کر رہی

ہو۔“

خلاف توقع وہ کچھ نہیں بولی اور ایک نظر ان پر ڈال کر فوراً کمرے سے نکل گئی تو کچھ دیر تک غزنوی اس کی خاموشی کو سوچتے رہے لیکن کوئی معنی نہیں پہن سکا۔ کیونکہ اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا۔ ابھی اگر خاموش ہو گئی تھی تو کچھ دیر بعد باقاعدہ ان کے خلاف محاذ کھول کر کھڑی ہو سکتی تھی۔ اور وہ اسی بات سے چڑتے تھے کہ کسی کا لحاظ ہی نہیں کرتی تھی۔ کسی کسی وقت ان کا دل چاہتا تھا، سب کے درمیان اس کے منہ پر زور دار تھپڑ دے ماریں کہ وہ پہلے جیسی ہو جائے جیسی شادی سے پہلے ہوا کرتی تھی لیکن پھر وہ اپنے آپ کو ٹوک کر سمجھاتے تھے کہ ٹھیک تو ہے۔ اس کمزوری لڑکی نے کیا پایا۔ اب کم از کم اپنے لیے لڑتو سکتی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کبھی اپنے لیے مثبت انداز سے سوچنا شروع کر دے۔ ابھی تو پتہ نہیں کیا سوچے ہوئے تھی۔ بہر حال یہ بھی غنیمت تھا کہ سامعہ کو اس نے پایا کہنے سے منع نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

حرانے گریجویشن کر لیا تو ایک بار پھر گھر میں شادی کے تذکرے ہونے لگے۔ شاید چھوٹے ابا اسی انتظار میں تھے۔ تین چار ماہ پہلے جب سیما کے ماموں نے شادی پر اصرار کیا تو انہوں نے یہی کہا تھا کہ چند مہینوں کی بات ہے۔ حرا اگر گریجویشن کر لے پھر وہ دونوں بیٹیوں کی ایک ساتھ شادی کریں گے۔ ادھر بڑے ابا بھی غزنوی اور تیمور کی ایک ساتھ کرنا چاہتے تھے لیکن غزنوی کا پھر وہی مسئلہ تھا۔ گو کہ سیرا کی شادی کے بعد سے بڑی اماں نے ان کے لیے کافی لڑکیاں دیکھی تھیں اور وہ ایک تو انہیں پسند بھی بہت تھیں لیکن غزنوی کسی کے لیے ہامی نہیں بھر رہے تھے۔ اور صاف منع بھی نہیں کرتے تھے۔ ابھی بھی بڑی اماں کے پوچھنے پر کہنے لگے۔

”جلدی کیا ہے؟ ہر کام اپنے وقت پر ہوتا ہے جب میری شادی کا وقت ہوگا، ہو جائے

گی۔ ابھی تو آپ تیمور کی کریں۔“

”تیمور کی تو کر ہی رہے ہیں لیکن مجھے تمہاری فکر ہے۔ اس گھر میں تم سب سے بڑے ہو اور اس حساب سے سب سے پہلے تمہاری شادی ہونی چاہیے تھی۔“

بڑی اماں نے انہیں بڑے ہونے کا احساس بھی دلایا جس پر وہ بڑے آرام سے تائید کرتے ہوئے بولے۔

”ٹھیک کہا آپ نے لیکن آپ ہی لوگوں نے الٹا چکر چلایا۔ یعنی جو سب سے چھوٹی تھی پہلے اس کی شادی کر دی تو اب اسی ترتیب سے چلیں اور اس حساب سے میری باری سب سے آخر میں آئے گی۔“

”کیا فضول بات کر رہے ہو! ہم میں سے کوئی بھی نومیہ کی شادی کے حق میں نہیں تھا۔ بچی کی عمر ہی کیا تھی لیکن اس کی ماں.....“

”کچھ بھی تھا۔ شادی تو ہوئی ناں اس کی۔“ وہ ٹوک کر بولے تو بڑی اماں کچھ دیر تک پُر سوچ انداز میں انہیں دیکھتی رہیں، پھر کہنے لگیں۔

”جب وہ لڑکی مانتی ہی نہیں تو ہم کیا کریں۔ زبردستی تو کر نہیں سکتے البتہ اس وقت ہو سکتی تھی جب تم باہر جا رہے تھے۔ اگر اشارتا بھی کہہ دیتے تو ہم اسی وقت تمہارا اس کے ساتھ نکاح کر دیتے۔ شادی تمہارے آنے پر ہو جاتی۔“

”اس وقت میرے دل میں ایسا کوئی خیال نہیں تھا۔“ وہ صاف گوئی سے بولے۔ پھر فوراً موضوع بدلتے ہوئے کہنے لگے۔ ”سیرا کو کچھ دنوں کے لیے بلا لیجئے۔ اتنا کام بڑھ جائے گا، آپ کا کچھ ہاتھ ہی بنا دے گی۔“

”ہاں! میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔“

”کہیں تو لے آؤں؟“

”نہیں! صبح اس کا فون آیا تھا۔ کہہ رہی تھی واثق لاہور جا رہا ہے اس کے بعد آئے

گی۔

بات اور تھی۔ یہی حالات آپ کے بھی تھے اور میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔“

”میری بیٹی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم میرے ہی راستے پر چلو۔ بڑا کٹھن راستہ

ہے۔“

”جانتی ہوں۔“ اس نے پتہ نہیں کس حساب سے دعویٰ کیا اور فوراً ان کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔ پھر کتنے چکر اوپر کے لگا ڈالے لیکن غزنوی سے سامنا نہیں ہوا۔ پتہ نہیں کہاں چلے گئے تھے اور ہمیشہ تو وہ کہیں سے بھی انہیں پکار لیتی یا بڑے آرام سے کسی سے بھی پوچھ لیتی لیکن اس وقت پتہ نہیں کیا بات تھی، وہ بڑی اماں کے پاس آئی بھی لیکن ان کے بارے میں نہیں پوچھ سکی۔ رات کے کھانے پر بھی وہ نظر نہیں آئے۔ اس کے بعد معمول سے زیادہ وقت اس نے ٹی وی لاؤنج میں گزارا۔

جب امی سامعہ کو لے کر سو گئیں تب بھی وہ اپنی کتابیں لے کر لاؤنج میں آ بیٹھی۔ تھی۔ کیونکہ غزنوی کو یہیں سے گزر کر جانا تھا۔ اور وہ ان سے اسی وقت بات کرنا چاہتی تھی۔ گیارہ بج رہے تھے جب وہ آئے اور وہ کیونکہ انہی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس لیے دیکھتے ہی بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ؟“

”کیوں؟“ انہوں نے رک کر سوالیہ نظروں سے دیکھا تو بس ایک لمحہ کو شپٹائی۔ پھر فوراً اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

”کیوں کا کیا مطلب؟“

”مطلب ہے جب ہی تو پوچھ رہا ہوں۔“

”کیا مطلب ہے؟“ وہ اب براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھنے لگی تو وہ چند قدم

آگے آ کر بولے۔

”پہلے تو تم نے کبھی نہیں پوچھا تھا۔ میں کہیں بھی گیا، کسی بھی وقت آیا۔“

”اچھا۔“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے محض اس خیال سے کہ کہیں پھر ان کی ذات موضوع نہ بن جائے۔ اور کمرے سے نکلنے لگے کہ بڑی اماں پکار کر بولیں۔

”سنو! میں تمہاری چچی جان سے بات کرتی ہوں، شاید نومیہ مان جائے۔ نہیں تو تمہیں میری بات ماننی پڑے گی۔“

انہوں نے پُرسوج انداز میں ذرا سا اثبات میں سر ہلایا اور کمرے سے نکل گئے۔ اور امی تو خود دل سے یہی چاہتی تھیں بلکہ ان کے نزدیک یہ نومیہ کی انتہائی خوش نصیبی تھی ورنہ ایک طلاق یافتہ اور پھر بچی کی ماں کو کون قبول کرتا ہے۔ پتہ نہیں نومیہ اس حقیقت کو کیوں نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس بار انہوں نے کچھ سختی سے کام لے کر اسے سمجھانے کی کوشش کی تو وہ چیخ پڑی۔

”مجھے شادی ہی نہیں کرنی، غزنوی سے نہ کسی اور سے۔ آپ کیوں خواہ مخواہ مجھے یہ باور کرانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ کوئی اور مجھے قبول نہیں کرے گا۔“

”لیکن بیٹا! غزنوی تو پورے خلوص سے.....“

”نہیں چاہیے مجھے کسی کا خلوص۔ آخر آپ کی سمجھ میں میری بات کیوں نہیں آتی۔ بار بار میرے منہ سے انکار کیوں سننا چاہتی ہیں۔“

”انکار ہی تو نہیں سننا چاہتی میں۔“ امی کے عاجزی سے کہنے پر وہ کچھ نرم پڑ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”آپ یہ موضوع چھیڑتی ہی کیوں ہیں۔ جب ایک بار میں منع کر چکی ہوں تو دوبارہ یہ سوال کیوں اٹھتا ہے۔ میں اب آخری بار آپ سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے شادی نہیں کرنی۔“

”ساری زندگی ایسے کیسے گزارو گی بیٹا!“

”آپ نے کیسے گزار دی؟“ وہ فوراً بول پڑی۔ ”اب یہ مت کہہ دیجئے گا کہ آپ کی

وہ بغیر کسی لحاظ کے ایک دم سے انہیں کٹہرے میں کھینچ لائی۔

”کیا آپ نے مجھے اپنی ضد بنا لیا ہے کہ ہر صورت مجھ سے شادی کریں گے۔ کیوں؟“

”ضد تو واقعی ہو گئی ہے مجھے لیکن میری ضد تم نہیں ہو۔“ انہوں نے رسان سے جواب دیا اور وہ بالکل نہیں سمجھی۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”بہت سیدھا سادا مطلب ہے لیکن تم نہیں سمجھو گی حالانکہ خود کو بہت عقلمند سمجھنے لگی ہو اور خود پر کتنے بھی خول چڑھا لو، اندر سے وہی سہمی ہوئی بزدلی لڑکی ہو۔“

”جی نہیں!“ وہ چیخ کر ٹوکتی ہوئی بولی۔ ”میں کیا ہوں اور خود کو کیا سمجھتی ہوں۔ یہ تو آپ رہنے ہی دیں۔ بس مجھے میری بات کا جواب چاہیے۔“

”کون سی بات کا؟“ وہ قصداً انجان بن کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے تو وہ زچ ہو کر بولی۔

”یہی کہ مجھ سے شادی کی کیا ضد ہے؟“ انہوں نے فوراً جواب نہیں دیا۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر ریک تک گئے۔ وہیں کھڑے ہو کر سگریٹ سلگایا۔ پھر دھیرے دھیرے چلتے ہوئے دوبارہ آکر بیٹھے تو کہنے لگے۔

”دیکھو! میں کوئی نوعمر جذباتی لڑکا نہیں ہوں جو یہ کہوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیا تم ایسی ہی کوئی بات سننا چاہتی ہو؟“

انہوں نے اچانک اسے دیکھ کر پوچھا تو وہ ایک دم اچھل کر بولی۔

”جی نہیں۔“

”بہر حال ایسی کوئی خواہش ہے بھی تو انہونی نہیں ہے اور جہاں تک شادی کا سوال ہے تو میں نے جذبات میں نہیں بلکہ بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے اور مجھے تم سے زیادہ سامعہ کا

”اب پوچھ کر گنہگار ہو گئی ہوں کیا؟“

”نہیں۔“ وہ حقیقتاً جھنجھلا گئے۔ کیونکہ جو جاننا چاہ رہے تھے، جان نہیں پائے اور وہ بڑے آرام سے کتابیں ایک طرف رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر انہیں دیکھ کر بولی۔

”خواہ مخواہ کیوں الجھ رہے ہیں۔ سیدھی سی بات ہے، میں آپ کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔ یہیں بیٹھیں گے یا.....“

”میرے کمرے میں آؤ!“ وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے اور ان کے پیچھے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے اور کچھ نہیں سوچا تو دھیرے دھیرے گنگنا نے لگی۔ کوئی اوٹ پٹانگ قسم کا گیت تھا جب ہی انہوں نے توجہ نہیں دی بلکہ آخر میں کئی سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگ گئے۔ اپنے کمرے میں آکر لائٹ آن کی۔ پھر بیٹھ کر شوز اتار رہے تھے، تب وہ داخل ہو کر پوچھنے لگی۔

”کھانا کھائیں گے؟“

”نہیں، میں ایک دوست کے ہاں گیا ہوا تھا۔ اس کی بیوی بہاری کباب بہت اچھے بناتی ہے۔“

”تو ابھی آپ بہاری کباب کھا کر آ رہے ہیں۔ وہ بھی دوست کی بیوی کے ہاتھ کے.....“ پھر تاسف بھری ہمدردی ظاہر کرتی ہوئی بولی۔

”ظاہر ہے اپنی بیوی تو ہے نہیں، دوستوں کی بیویاں ہی سہی۔“

”دیکھو! میں اس وقت کوئی فضول بات سننے کے موڈ میں نہیں ہوں، تمہیں اگر اسی قسم کی بکواس کرنی ہے تو فوراً چلی جاؤ۔“

وہ ٹوکتے ہوئے اٹھ کر داش روم میں چلے گئے۔ منہ ہاتھ دھو کر واپس آئے تو وہ اسی طرح بیٹھی تھی۔ اور وہ چاہنے کے باوجود نظر انداز نہیں کر سکے۔ بیٹھتے ہی پوچھنے لگے۔

”کیا بات ہے، کچھ پریشان ہو؟“

”ہاں! اور میری پریشانی کا سبب آپ ہیں۔“

اپنی باتوں کا الٹا اثر دیکھ کر ان کا دماغ گھوم گیا۔ اور سچ مچ اس کے منہ پر طمانچہ مارنے کے لیے اٹھے تھے لیکن اس سے پہلے ہی وہ کرسی کو ٹھوکر مارتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی۔ بے حد تملنائی ہوئی تھی۔ نیچے آکر کتنی دیر تک اپنے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہکتی رہی۔ توہین کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ یعنی وہ مسلسل اس کی ضرورت کو جتا کر ایک طرح سے اس کی جھولی میں خیرات ڈالنا چاہتے تھے۔ اب ایسی بھی ضرورت مند نہیں تھی وہ۔

”سامعہ کو باپ کی اور تمہیں سائبان کی ضرورت ہے.....“

اُف ان کا یہ جملہ مسلسل اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا۔ کچھ اور سوچا ہی نہیں گیا۔ حالانکہ اس وقت وہ انہیں اپنا ہمدرد و ہمد جان کر ان کے پاس گئی تھی تاکہ انہیں بتا سکے کہ جن آنے والے وقتوں کی وہ نشاندہی کرتے ہیں، ان سے وہ خود آگاہ ہے۔ اور یہ بھی جانتی ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے جیسا کہ انہوں نے کہا تھا۔

”زمانہ بدل گیا ہے۔ محبتیں، رواداریاں سب وقت اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا ہے۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے جب چچی جان تمہاری انگلی تھام کر دوبارہ اس گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ تو انہیں یقین تھا کہ یہاں تمہیں باپ نہیں تو باپ جیسی شفقتیں ضرور ملیں گی۔ اور یہ تم جانتی ہو کہ ان کے یقین کو کہیں شخص نہیں پہنچی۔ کیا تمہارے پاس ایسا کوئی یقین ہے؟“

اور واقعی اس کے پاس ایسا کوئی یقین نہیں تھا۔ سب کی محبتوں کے باوجود وہ جانتی تھی کہ سامعہ کے لیے کوئی بھی بڑے ابا اور چھوٹے ابا نہیں بن سکتا۔ ایسے میں غزنوی کا سامعہ کو باپ کی شفقت دینے کا دعویٰ حقیقتاً اس کی تاریک راہوں میں جگمگاتی کرن کی مانند تھا لیکن وہ اتنی مجبور و بے بس تھی یا کر دی گئی تھی کہ چاہتی بھی تو اس کرن سے اپنی زندگی میں اجالا نہیں کر سکتی تھی۔ اصل میں اندر سے وہ ابھی بھی بہت سہمی ہوئی تھی کیونکہ بات صرف اتنی ہی نہیں تھی کہ سرال والوں نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

وہ سارے ظلم و زیادتیاں بھلا سکتی تھی لیکن ان کے مظالم کی حدود ہیں پر ختم نہیں ہو گئی تھی

خیال ہے۔ پتہ نہیں تم کس بنا پر، اس بچی کو محروم رکھنا چاہتی ہو۔ حالانکہ میں تمہیں اس وقت سے ہی آگاہ کر چکا ہوں جب سب اپنے اپنے بال بچوں میں مصروف ہو جائیں گے۔ پھر بھی تم سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہیں یا قصداً نظریں پڑا رہی ہو۔ کچھ بھی ہے تمہاری ضد نہ صرف بچی بلکہ خود تمہارے حق میں بھی ٹھیک نہیں ہے۔“

قدرے توقف سے پھر کہنے لگے۔

”تم ابھی کم عمر ہو، نادان ہو، میں نہیں چاہتا کہ چند سال بعد احساس ہونے پر تمہارے پاس سوائے کچھتاؤں کے اور کچھ نہ ہو۔ ابھی وقت تمہاری دسترس میں ہے۔ سامعہ کو باپ کی اور تمہیں سائبان کی ضرورت ہے۔ اس حقیقت سے انکار کر کے اس وقت کو مت گنواؤ۔“

وہ جس خاموشی سے انہیں سن رہی تھی، اس سے وہ یہی سمجھے کہ قائل ہو رہی ہے، جیہی آخر میں پر امید نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ تو وہ گہری سانس سینے کے اندر روک کر بے سوچ انداز میں بولی۔

”سامعہ کو باپ کی اور مجھے سائبان کی ضرورت ہے، یہی کہاناں آپ نے۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا، تو کچھ طنز آمیز تلخی سے بولی۔

”اور آپ ہماری ضرورت۔“

”ایک منٹ۔“ وہ فوراً ٹوک کر بولے۔ ”سوچ سمجھ کر بولنا۔ میں کوئی بھی غلط، بے ہودہ بات برداشت نہیں کروں گا۔“

”اور میں جو اتنی دیر سے برداشت کر رہی ہوں وہ!“

”کیا میں نے غلط کہا ہے؟“

”ٹھیک بھی نہیں کہا۔ کوئی ضرورت نہیں ہے ہمیں آپ کی۔ سامعہ کا باپ زندہ ہے۔ جب کبھی وہ اس کی ضرورت محسوس کرے گی میں اسے اس کے پاس بھیج دوں گی۔ سمجھے آپ!“

سامعہ اس کے تپھر سے دور جا گری تھی۔ اور ظاہر ہے بلبلہ کر رہی تھی۔ جبکہ غزنوی بس ایک پل کو سناٹے میں آئے، پھر اس پر برس پڑے۔

”پاگل ہو گئی ہو کیا؟ اتنی سی بچی کو مارتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گا۔“

اس کے ساتھ ہی انہوں نے سامعہ کو اٹھانا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی اس نے بچی کو کلائی سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا جس سے وہ اور زیادہ رونے لگی۔

”کیا بات ہے؟“ ادھر سے امی، ادھر سے بڑی اماں اور باری باری سب نکل کر آ گئے تو اس نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔

”میری بچی ہے، میں اسے ماروں یا پیار کروں، کوئی نہیں روک سکتا مجھے۔ اور بڑی اماں! پوچھیں غزنوی سے، یہ کون ہوتے ہیں میرے ہاتھ توڑنے والے۔“ بڑی اماں نے غزنوی کو دیکھا تو وہ بھی غصے سے بولے۔

”بالکل! میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گا اگر آئندہ اس نے سامعہ کو مارا تو۔“

”ماروں گی۔“

”نومیہ!“ بڑی اماں نے تنبیہی لہجے میں اسے ٹوکا۔ ”کیوں مارو گی اتنی سی بچی مار

کھانے کے لائق ہے؟“

”آپ کو نہیں پتہ بڑی اماں، یہ بہت بد تمیز ہو گئی ہے۔“ اس کی بات پر جہاں غزنوی نے ہونہر کے انداز میں سر جھٹکا وہاں حرا اور سیما منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگیں۔

”تو بیٹا! پیار سے سمجھاؤ۔ مارنے سے تو ڈھیٹ ہو جائے گی۔“ بڑی اماں نے کہا تو غزنوی احتجاج کرتے ہوئے بولے۔

”کیا بات کرتی ہیں اماں! یہ دو سال کی بچی کیا بد تمیزی کر سکتی ہے، ابھی تو اسے کسی بات کی سمجھ ہی نہیں ہے۔“

بلکہ آگے بھی انہوں نے اس کے لیے زندگی کے راستے بند کر دیے تھے کہ اسے گھر سے نکالتے ہوئے اس کے شوہر عارف نے اس سے ایک سادہ اشٹام پیپر پر سائن لے کر پھر اس کے اوپر یہ تحریر لکھی تھی کہ اگر وہ دوسری شادی کر لے گی تو سامعہ پر اس کا کوئی حق نہیں ہوگا۔ اور وہ اپنے سارے حقوق چھوڑ سکتی تھی لیکن سامعہ سے دوری کا تصور ہی سوہان روح تھا۔ یہ بات اگر وہ اول روز ہی بڑے ابا کو بتا دیتی تو وہ اس کا کوئی حل سوچ سکتے تھے۔ بلکہ یقیناً وہ اس سلسلے میں کوئی اقدام کرتے لیکن وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ ابھی تک کسی کو نہیں بتایا تھا۔ غزنوی ٹھیک کہتے تھے کہ وہ خود پر کتنے بھی خول چڑھا لے اندر سے وہی سہمی ہوئی بزدلی لڑکی ہے اور اس بزدل لڑکی کو بس یہی خوف تھا کہ کہیں عارف سامعہ کو اس سے چھین نہ لے۔ جب ہی آنے والے وقتوں سے آگاہی کے باوجود شادی سے انکاری تھی۔ اور بار بار انکار کے بعد بھی جب اس نے دیکھا کہ غزنوی اپنی ضد پر قائم ہیں، اور سامعہ کو بھی انہوں نے خود سے بہت مانوس کر لیا ہے۔ تب ان ساری باتوں کے پیچھے کسی بے نام جذبے کا گمان ہوتے ہی اس نے سوچا تھا کہ وہ غزنوی کو اپنے انکار کی اصل وجہ بتا کر پوچھے گی کہ اب وہ اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں لیکن انہوں نے صرف اس کی ضرورت کو جتا کر حقیقتاً اسے مایوس کر دیا تھا۔

زندگی بھر کا بندھن اگر صرف ضرورت کی بنیاد پر نبھایا جاسکتا تو وہ عارف کے پاؤں پڑ کر اس کی منتیں کر لیتی کہ وہ اسے اپنے در پر پڑا رہنے دے۔ کاش غزنوی کوئی اور تعلق ظاہر کرتے۔ گہری نہ سہی تھوڑی سی وابستگی۔ تب وہ انہیں اپنے خوف سے آگاہ کر کے خود اطمینان سے ہو جاتی اور اطمینان تو دور کی بات، انہوں نے تو اس کا اپنی ذات پر مان بھی چھین لیا تھا۔ اسے ضرورت مند کہہ کر جس سے وہ اس بری طرح تلمٹائی ہوئی تھی کہ اگلے روز عین اس وقت جب سامعہ پاپا، پاپا پکارتی ہوئی ان کی طرف بڑھ رہی تھی، اس نے درمیان میں آ کر بچی کے پھول سے رخسار پر زور دار تپھر دے مارا اور دانت پیس کر بولی۔

”یہ تمہارے پاپا نہیں ہیں۔“

دیکھنے لگے تھے۔ آخر میں خود ہی ہٹا کر بولی۔

”ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

”نکل جاؤ میرے کمرے سے۔“ انہوں نے انتہائی غصے سے دروازے کی طرف

اشارہ کیا۔

”ارے! میں تو آپ کو مبارکباد.....“ وہ کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہوئے۔ اسے بازو سر

پکڑ کر کمرے سے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔

☆☆☆

گھر میں ایک ساتھ چار شادیاں تھیں اور ادھر اس کے امتحان بھی قریب آ گئے تھے۔ بڑی اماں نے میرا کو بلا تو لیا تھا لیکن وہ زیادہ بھاگ دوڑ کے کام نہیں کر سکتی تھی کیونکہ مال بننے والی تھی۔ اور ان دنوں ڈاکٹر نے اسے ریٹ بتایا تھا۔ یوں وہی گھن چکر بن کر رہ گئی۔ کام سے وہ جی نہیں چراتی تھی لیکن جو امتحانوں کا ہوا سر پر سوار تھا اس سے اور زیادہ بوکھلائی ہوئی تھی کیونکہ پڑھنے کا بالکل وقت نہیں ملتا تھا۔ خدا خدا کر کے شادی کے ہنگامے تمام ہوئے اور اس سر بھی سکون کا سانس لیا۔ ایک صرف سیما اس گھر سے رخصت ہو کر گئی تھی۔ باقی حرا یہیں تھی اور ظاہر ہے غزنوی بھی دلہن لے آئے تھے۔ پھر نو بیہتا جوڑے تو دعوتوں اور سیر و تفریح میں لگ گئے۔ اور اس نے الگ تھلگ کمرے میں خود کو بند کر لیا۔ پہلے ہی بہت نقصان ہو چکا تھا۔ اب وہ ایک لمبے ضائع نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے یکسوئی سے پڑھنے میں لگ گئی۔ یہاں تک کہ امتحانوں تک اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

جس روز آخری پیپر دے کر آئی، برآمدے میں ہی کھڑی ہو کر شور مچانے لگی کہ امتحان ختم ہو گئے۔ سر سے بوجھ اتر گیا۔ معاً نظر غزنوی کی دلہن افشاں پر پڑی جو سیڑھیوں کے قریب کھڑی بہت غور سے اسے دیکھ رہی تھی اور وہ اپنی دھن میں اسے مخاطب کر کے بولی۔

”ارے بھائی! آج سے میں فارغ ہوں، بہت کمپنی دوں گی آپ کو۔“

”مجھے تو ہے۔“ وہ فوراً بول پڑی اور اس سے پہلے غزنوی اس کا مذاق اڑاتے وہ انہیں دیکھ کر کہنے لگی۔ ”اور آپ کو بھی سمجھنا چاہیے کہ ابھی تو نا سنجھی میں آپ کو پاپا کہہ رہی ہے۔ اور جب اسے معلوم ہوگا کہ آپ اس کے پاپا نہیں ہیں تو اس وقت اس کی کیا حالت ہوگی۔“

”نان سنس۔“ غزنوی خواتین کی موجودگی میں چکرا گئے۔ اور اس کی بدلتا ہی پر تلملاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ تب چھوٹی اماں اس کے قریب آ کر بولیں۔

”بیٹا! اسی لیے تو ہم تمہیں شادی پر زور دے رہے ہیں۔“

”اُف! یہ ہر بات کی تان میری شادی پر کیوں ٹوٹتی ہے۔ مجھے نہیں کرنی شادی

وادی۔“

وہ چڑ کر بولی اور سامعہ کو امی کی گود میں ڈال کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو بڑی اماں نے امی کو یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں بس اب بات ختم ہو گئی۔

☆☆☆

اور پھر واقعی اگلے چند دنوں میں بڑی اماں نے غزنوی کی کہیں اور بات طے کر دی۔ اس نے سنا تو کچھ دیر کو اپنی زندگی کی راہوں پر دور دور پھیل جانے والی تاریکی کو شدت سے محسوس کیا۔ اس کے بعد بڑے آرام سے انہیں مبارکباد دینے پہنچ گئی۔

”ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ تیور بھائی کے ساتھ ساتھ آپ کی ڈولی اٹھنے کا سامان بھی ہو گیا ہے۔“ وہ کہہ کر خود ہی ہنسی۔ پھر ان کے سپاٹ چہرے کو دیکھ کر پوچھنے لگی

”کون ہے بیچاری؟“

”اماں سے پوچھ لو!“ وہ کہہ کر الماری کی طرف بڑھ گئے اور ان کے پیچھے آتے ہوئے بولی۔

”کیوں آپ کو شرم آتی ہے، میرا مطلب ہے نام لیتے ہوئے یا نکاح ٹوٹ جانے کا۔ لیکن ابھی نکاح تو ہوا ہی نہیں۔“ اس کی تیزی سے چلتی زبان پر وہ بہت خاموشی سے اسے

”یہ کیا نیا طریقہ نکالا ہے تم نے؟“

”کون سا؟“ وہ سمجھی نہیں۔

”ہاتھ میں روٹی لے کر کھانے کا۔“

”سب چلتا ہے۔“ حالانکہ وہ کھا نہیں رہی تھی لیکن محض انہیں چڑانے کی خاطر نوالہ توڑ

کر منہ میں رکھ لیا۔ اور ڈھنٹائی سے ہنسنے لگی تو وہ سر جھٹک کر آگے بڑھ گئے۔ تب ہی حرا کی انگلی

تھامے سامعہ اس کے کمرے سے نکلی اور غزنوی کو دیکھ کر پاپا، پاپا کہتی ان کے پیچھے چل پڑی۔ وہ

بس ایک پل کو سامعہ کی طرف متوجہ ہوئی تھی کہ حرا کے پکارنے پر اس کا دھیان بٹ گیا۔

”کیا ہوا؟“ حرا پوچھ رہی تھی۔ ”غزنوی بھائی خفا ہو رہے تھے کیا؟“

”ارے! وہ کب خفا نہیں ہوتے۔ خیر چھوڑو! تم سناؤ۔“

”سب ٹھیک ٹھاک اور یہ تم خالی روٹی کیوں کھا رہی ہو۔ سالن نہیں ہے کیا؟“ شاید

بھوک کی وجہ سے یا بے خیالی میں وہ آدھی سے زیادہ روٹی کھا چکی تھی۔ حرا نے تعجب سے ٹوکا تو

پیشانی پر ہاتھ مارتی ہوئی بولی۔

”لا حول ولا۔ سالن تو نیچے گرم کر کے رکھ آئی ہوں۔“

”چلو اب تو کھا چکی ہو، میرا مطلب ہے میں چائے بنانے جا رہی ہوں۔ ساتھ میں

کباب بھی تلوں گی۔ تم بیٹھو بڑی اماں کے پاس میں لے کر آتی ہوں۔“

حرا نے اسے روکتے ہوئے کہا تو وہ ہاتھ میں بچی ہوئی روٹی اسے تھما کر بولی۔

”یہ بھی لے جاؤ! اور کباب ذرا جلدی تلنا۔“ حرا اثبات میں سر ہلاتی کچن میں چلی

گئی۔ اور وہ بڑی اماں کے پاس آ رہی تھی کہ غزنوی کے کمرے سے آتی افشاں کی آواز سن کر

اچانک اسے دوپہر کی بات یاد آ گئی۔

”تمہاری بیٹی کیا کم ہے؟“

اور پھر اسے خیال آیا کہ ابھی بھی سامعہ غزنوی کے پیچھے گئی تھی۔ فوراً اسے لینے کے

”بیٹی کیا کم ہے!“ افشاں کے ٹھہرے ہوئے سپاٹ لہجے نے ایک پل تو اسے

اپنی جگہ سُن کر دیا۔ پھر چونک کر پھبکی مسکراہٹ سے بولی۔

”سامعہ، ہاں سامعہ تو سب کے ساتھ مانوس ہو جاتی ہے۔“

”کچھ زیادہ ہی۔“ افشاں کہہ کر سیڑھیاں چڑھ گئی اور وہ کتنی دیر تک اس کے پیچھے

نظریں جمائے کھڑی رہی۔ پھر مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے میں آئی تو امی ظہر کی نماز

پڑھ رہی تھیں۔ اور سامعہ ان کے پلنگ پر بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے کندھے سے بیگ اتار کر ایک

طرف رکھا اور کپڑے تبدیل کیے بغیر سامعہ کے برابر آ کر لیٹی تو اسے اپنے بازو کے حلقے میں لے

لیا۔ اس ایک ماہ میں پتہ نہیں کیا سے کیا ہو گیا تھا اور وہ کتنی بے خبر تھی۔

”یہ برسوں پہلے کی بات ہے جب میں یہاں آئی تھی تو میرے لیے سب کے دلوں

میں کتنی وسعتیں تھیں۔ اب وقت بدل گیا ہے۔“ وہ سوچتے سوچتے سو گئی۔

شام میں ابھی تو سامعہ اس کے پہلو میں نہیں تھی اور فوری طور پر اسے خیال بھی نہیں

آیا۔ اطمینان سے منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے باہر نکلی تو امی نے دیکھتے ہی ٹوکا۔

”کھانا کھائے بغیر سو گئی تھی۔ جاؤ! پہلے کھانا کھاؤ۔“

”ہاں! بھوک بھی لگ رہی ہے۔“ اس نے وہیں سے کچن کا رخ کیا۔ سالن گرم

کر کے پلیٹ میں نکالا اور جب ہاٹ ہاٹ کھولا تو روٹی نہیں تھی۔ کچھ جھنجھلا کر اس نے سالن کی

پلیٹ چولہے کے نیچے دھکیل دی۔ پھر کچن سے نکل کر اوپر چلی آئی۔

”بڑی اماں! روٹی ہے؟“ اس نے باہر ہی سے پکار کر پوچھا۔ بڑی اماں نے اندر ہی

سے جواب دیا۔

”کچن میں دیکھ لو بیٹا! ہوگی۔ اور دیکھو فریج میں کباب رکھے ہیں وہ بھی تل لو۔“

”نہیں بس، مجھے روٹی چاہیے۔“ اس نے کچن میں آ کر ہاٹ ہاٹ سپاٹ میں سے ایک روٹی

نکالی اور یونہی ہاتھ میں لیے باہر نکلی تو سامنے سے آتے غزنوی نے دیکھتے ہی ٹوکا۔

”یہ کون سا طریقہ ہے اندر آنے کا! دستک دے کر آیا کرو۔“ اس کی ساری تیزی دھری رہ گئی۔ نہ صرف شیشائی بلکہ نخل ہو کر بولی۔

”سوری! میں سامعہ کو لینے آئی تھی۔“

”دیکھ لو! اپنے پاپا کی گود میں بہت خوش ہے۔“

افشاں کا طنز اس کے دل میں ترازو ہو گیا۔ چپ چاپ سامعہ کو اٹھا کر کمرے سے نکل آئی تو حرا چائے کی ٹرے اٹھائے آرہی تھی۔ وہ اس کا بلکہ اس وقت کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجبوراً حرا کی طرف سے رخ موڑ کر اس کے آگے آگے چلنے لگی۔ پھر بڑی اماں کے پاس بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے وہ ذہنی طور پر وہاں موجود نہیں تھی۔ ایک دو بار حرا نے ٹوکا بھی اور وہ بس ہوں ہاں کر کے رہ گئی۔

”یہ برسوں پہلے کی بات ہے جب میں یہاں آئی تھی۔“ رات میں وہ منتشر ذہن کے ساتھ جانے کیا کیا سوچے گئی۔ اور کسی ایک سوچ پر اس کی گرفت نہیں ہو سکی۔

”وقت سب کچھ اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ محبتیں، رواداریاں، خلوص.....“

”میں تمہیں اس وقت سے آگاہ کر رہا ہوں جب سب اپنے اپنے بال بچوں میں مصروف ہو جائیں گے۔“

”سامعہ کو باپ کی ضرورت ہے اور تمہیں سائبان کی.....“

وہ ایک ایک سوچ پر سر جھٹکتی گئی۔ پھر بھی اس کا اضطراب کم نہیں ہوا۔ کتنی دیر تک افشاں کے خلاف اس کے اندر لاوا پکنا رہا۔ دل چاہا، اپنی بچی سے بغض رکھنے پر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔

”اپنا وقت تو برا بھلا جو بھی گزار چکی، دوسروں کا ذرا احساس نہیں۔“

معاً افشاں کی بات نے اس کی ساری سوچوں کو سمیٹ لیا تو بس کچھ دیر کو وہ تلملائی۔ اس کے بعد فراخ دلی سے اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

ارادے سے آگے بڑھی لیکن افشاں کی آواز پر اس کے قدم دروازے پر ہی رک گئے۔

”یہ بچی اول روز سے ہمارے درمیان کھڑی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب اس کی ماں کو اس کی پروا نہیں ہے تو آپ کیوں اسے اتنی اہمیت دیتے ہیں۔“

”تم سے کس نے کہا ہے اس کی ماں کو اس کی پروا نہیں ہے۔“ غزنوی کا انداز دھیمہ تھا جبکہ افشاں تیز ہو کر بول رہی تھی۔

”کون کہے گا، کیا میں خود نہیں دیکھتی۔ نومیہ نے تو اپنی جان چھڑائی ہوئی ہے۔ اور اسے پروا ہو بھی کیوں، جب بچی کے لیے ماں اور باپ کا کردار آپ بخوبی ادا کر رہے ہیں۔“

”افشاں!“

غزنوی جانے کیا کہنے جا رہے تھے۔ لیکن افشاں نے انہیں بولنے ہی نہیں دیا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ نومیہ جان بوجھ کر اسے آپ کے پیچھے لگائے رکھتی ہے۔ اپنا وقت تو برا بھلا جو بھی گزار چکی، دوسروں کا ذرا احساس نہیں۔“

”ڈونٹ بی سلی افشاں! میں ایسی فضول باتیں پسند نہیں کرتا۔“ غزنوی بہت ضبط سے بولے لیکن لہجے میں چھپی تلخی محسوس ہو رہی تھی۔ جواباً افشاں کے لہجے میں طنز سمٹ آیا۔

”تو اور کیا پسند کرتے ہیں آپ، یہ بھی بتا دیجئے۔“

”بس خاموش رہو!“

”سوری غزنوی! آپ مجھے خاموش نہیں کرا سکتے۔ میں پتھر کی بے جان مورتی نہیں ہوں جو چپ چاپ دیکھتی رہوں، اور اب تو میں آپ سے یہ سوال کروں گی کہ اگر آپ کو اس بچی کا باپ بننے کا اتنا ہی شوق تھا تو بن کیوں نہیں گئے۔“

اور غزنوی پتہ نہیں کیا جواب دیتے کہ وہ جو اس طرف سناٹے میں کھڑی تھی ایک دم ہوش میں آ کر دروازہ دھکیلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی اور ابھی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ افشاں نے فوراً ٹوک دیا۔

”سامعہ!“

”پاپا۔“ سامعہ قاعدہ چھوڑ کر اسے یوں دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی ہو۔ ”یہ پاپا کی آواز ہے؟“ اس کا معصوم چہرہ کھل اٹھا تھا۔
 ”نہیں! تم یہ دیکھو۔ دیکھو یہ کیا ہے۔“ وہ اس کا دھیان بٹانے لگی لیکن بچی مچل گئی تب ہی غزنوی پکارتے ہوئے وہیں آگئے تو وہ بلا ارادہ ہی سامعہ کے سامنے دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ فوراً سمجھے نہیں اور ادھر ادھر دیکھ کر پوچھنے لگے۔
 ”سامعہ کہاں ہے.....؟“

”کیوں.....؟“ وہ تنک کر بولی جس پر وہ بس ایک پل کو ڈھنڈھکے کیونکہ فوراً بعد ہی سامعہ نے اس کے پیچھے سے سر نکال کر ان کی توجہ کھینچ لی۔
 پاپا! میں یہاں.....“

”ارے.....!“ انہوں نے اس کی طرف بازو پھیلا دیے تو سامعہ بھاگ کر ان کے بازوؤں میں سما گئی۔ وہ ہونٹ بھینچ کر انہیں دیکھتی رہی اور جیسے ہی وہ سامعہ کو لے کر جانے لگے، وہ فوراً پکار کر بولی۔

”نہیں غزنوی! اسے یہیں چھوڑ دیں.....“
 ”کیوں.....؟“ ان کی سوالیہ نظروں سے وہ جزبہ ہو کر بولی۔
 ”یہ اس کے پڑھنے کا وقت ہے۔“
 ”اچھا.....! وہ بے ساختہ ہنس کر بولے۔ ”پہلے تم تو پڑھ لو۔“
 ”میں مذاق نہیں کر رہی۔“

”میں بھی مذاق نہیں کر رہا۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر اس کی طرف پلٹے۔ پھر چند قدم آگے آ کر پوچھنے لگے۔ ”تم چاہتی کیا ہو؟ سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہو گیا، پھر اب تمہیں کس بات کا خدشہ ہے۔“

”ٹھیک تو ہے مجھے خیال کرنا چاہیے۔ افشاں کے اپنے خواب ہوں گے، اپنا انداز ہو گا۔ جبکہ غزنوی آفس سے آتے ہی سامعہ کو لیے ہوئے اوپر جاتے ہیں اور سامعہ بچی سہی پھر بھی۔“
 اور تب اس کی سمجھ میں آیا کہ امی نے ہمیشہ اسے اپنی آغوش میں کیوں چھپائے رکھا۔ اسے کبھی بڑے ابا اور چھوٹے ابا کے پیچھے لپک کر کیوں نہیں جانے دیا۔ یہاں تک کہ جب انہیں اپنے مرنے کا وہم ہوا تو یہ تو نہیں تھا کہ انہیں کسی پر بھروسہ نہیں تھا بلکہ وہ ان محبتوں اور شفقتوں کو قائم رکھنا چاہتی تھیں۔ یہ نہ ہو کہ ان کے بعد بڑے ابا اور چھوٹے ابا یتیم بھتیجی پر کچھ وقت کو ہی سہی کچھ زیادہ عنایتیں کر بیٹھیں اور یہ بات بڑی اماں اور چھوٹی اماں کو ناگوار گزرے۔ اس لیے اسے اس کے گھر کا کر دیا تھا۔ بظاہر سیدھی سادی امی! وہ انہیں سمجھنے میں کتنی غلطی کر گئی تھی۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ زمانہ نہیں بدلا نہ ہی وقت اپنے ساتھ محبتیں اور رواداریاں بہا لے گیا ہے۔ الہیہ محبتوں کو سمجھنے، برتنے اور سنبھال کر رکھنے کا ڈھنگ نہیں رہا۔

☆☆☆

اگلے روز غزنوی کے آفس نے لوٹنے سے پہلے ہی وہ کچھ چھوٹی موٹی چیزیں خریدنے کے بہانے سامعہ کو لے کر قریبی مارکیٹ چلی گئی۔ ایک دم سے بچی کو الگ کرنا آسان نہیں تھا، نہ ہی مناسب۔ یوں بھی وہ اس سے زیادہ گھر کے باقی افراد سے مانوس تھی۔ وہ تو اب تک اس کے لیے ظالم ماں بنی ہوئی تھی اور ظاہر ہے اب دھیرے دھیرے ہی اسے اپنی طرف راغب کیا جاسکتا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ امتحانوں کے بعد کچھ وقت اس کے پاس فراغت کا تھا اور اس وقت سے وہ فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ بہر حال کسی پر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا اور بالکل غیر محسوس طریقے سے سامعہ کو اپنے ساتھ لگائے رکھتی۔ خصوصاً صبح اور شام کے اوقات میں۔

اس کے لیے وہ ابتدائی اردو اور انگریزی کے قاعدے خرید لائی تھی۔ اس کا ارادہ اسی سال اسے مونٹیسری میں داخل کروانے کا تھا۔ اس وقت وہ اس کے سامنے رنگین قاعدہ کھولے اسے تصویروں سے بہلا رہی تھی کہ غزنوی نے برآمدے سے ہی پکارا۔

”اسی وقت سے میں تمہیں آگاہ کرتا تھا، پر تم نہیں سمجھیں۔“

اور وہ کیسے کہہ دیتی کہ انہیں آگاہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ خود سب سمجھتی تھی۔ اگر وہ اسے ضرورت مند کہنے کی بجائے اپنا کوئی تعلق ظاہر کرتے تب تو اس وقت پر اپنی گرفت مضبوط کرتی۔ اب تو کوئی ملال نہیں تھا بلکہ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کتنے آرام سے سرخرو ہو گئے تھے۔

☆☆☆

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس نے اپنے رزلٹ سے پہلے ہی سامعہ کو مونیسری میں داخل کرادیا۔ امی منع کرتی رہ گئیں لیکن اس نے ایک نہیں سنی۔ یوں بھی اس پر ”من مانی“ کی چھاپ لگ چکی تھی۔

رزلٹ کے بعد اس نے کالج جانا شروع کیا تو صبح اپنے ساتھ سامعہ کو لے کر نکلتی۔ البتہ واپسی میں اسے دیر ہو جاتی تھی اس لیے سامعہ کو لانے کی ذمہ داری امی کی تھی۔ پھر جب وہ آتی تو اسے اپنے ساتھ لے کر سوتی اور شام کا سارا وقت اس کے ساتھ کھیلنے اور پڑھنے پڑھانے میں گزارتی۔

سامعہ بچی تھی۔ اس کی غیر معمولی توجہ اور محبت سے بہت جلدی بہل گئی۔ یعنی اب وہ غزنوی کو دیکھ کر ان کی طرف لپکتی نہیں تھی جبکہ غزنوی کو خود پر جبر کرنا پڑ رہا تھا۔ اس کی مجبوری سمجھتے ہوئے سامعہ کو نظر انداز کرنے پر مجبور تھے لیکن کسی کسی وقت بالکل بے اختیار ہو جاتے۔ اس وقت باہر جاتے ہوئے وہ انہیں برآمدے میں کھیلتی نظر آتی تو وہ اسے ساتھ لے کر باہر نکل گئے۔

چھٹی کا دن تھا۔ وہ اس وقت آنگن میں کپڑے پھیلاتے ہوئے اپنے ہی کسی خیال میں تھی اور اس نے دیکھا ضرور کہ غزنوی سامعہ کو لے کر جا رہے ہیں لیکن ٹوکا نہیں۔ یوں بھی اب اس کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس نے بہت جلدی سامعہ پر کنٹرول کر لیا تھا۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ افشاں ابھی بھی تاک میں رہتی ہے کہ اول روز اپنے اور غزنوی کے درمیان جس بچی کو اس

”جانے دیں، میں سچ کہوں گی اور آپ.....“

”نہیں تم کہو.....“ وہ فوراً ٹوک کر بولے تو کچھ دیر تک وہ انہیں دیکھتی رہی۔ پھر نظریں چراتی ہوئی بولی۔

”دیکھیں غزنوی! مجھے اسی گھر میں رہنا ہے۔ اس کے علاوہ میرا کہیں کوئی ٹھکانہ نہیں۔ یہ آپ بھی جانتے ہیں، پھر میرے لیے مشکلات کیوں کھڑی کر رہے ہیں؟ میں نہیں چاہتی کہ سامعہ آپ کی ازدواجی زندگی پر اثر انداز ہو۔ اور آپ سے بھی درخواست کروں گی کہ میری بچی کو وجہ تنازعہ مت بنائیں۔ میرے لیے زندگی کے راستے تنگ ہو جائیں گے۔ کہاں جاؤں گی میں۔ اس کے باپ کے گھر سے میرا کوئی ناتا نہیں ورنہ امی کی طرح میں بھی اس کی انگلی تھام کر.....“

اس کی آواز بھڑائی تو جلدی سے ان کی طرف سے رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی جب کہ ان کا وجود گہری خاموشیوں کی زد میں آ گیا تھا۔ کتنی دیر بعد وہ بولنے کے قابل ہو سکے۔

”افشاں نے کچھ کہا تم سے.....؟“

”نہیں.....“ وہ پلکوں تک آنی نمی انگلیوں پر سمیٹتی ہوئی بولی۔ ”ابھی تک تو کچھ نہیں کہا لیکن کہہ سکتی ہے۔ اور یہ اس کا حق ہے جو کہ آپ کو تسلیم کرنا چاہیے۔“

”میں اس کے سارے حقوق تسلیم کرتا ہوں لیکن میری ذات پر ایک صرف وہی حق نہیں رکھتی.....“ وہ کہہ کر جانے لگے کہ وہ بھاگ کر ان کے سامنے آگئی۔

”سامعہ کو مجھے دے دیں.....“

”بلا کر دیکھو، اگر تمہارے پاس آگئی تو.....“

وہ ایک دم ہونٹ بھیجنے لگے، اور سامعہ جو اس کی طرف سے منہ موڑ کر ان کے گلے کا ہار بن گئی تھی۔ خود پر جبر کر کے انہوں نے اسے الگ کر کے اس کی گود میں ڈال دیا۔ پھر جاتے جاتے بولے تھے۔

آمد ہوئی۔ سامعہ ان کی انگلی تھام کر چل رہی تھی۔ قریب آتے ہی انہیں چھوڑ کر اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی تو صورت حال سے بے خبر غزنوی ہنس کر بولے۔

”واہ نومیہ! تم نے تو کمال کر دیا۔ یعنی اب میں تمہیں چیلنج نہیں کر سکتا کہ سامعہ کو بلا کر دیکھو.....“ اس کے وجود میں کوئی حرکت نہیں ہوئی اور افشاں بول پڑی۔

”کہاں چلے گئے تھے۔ پتہ بھی تھا امی کے گھر جانا ہے۔“
افشاں کی تیز آواز پر بھی وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے کیونکہ نومیہ کے گم صم انداز پر وہ ٹھنک گئے تھے اور بے اختیار اس کے سامنے بچوں پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

”کیا ہوا نومیہ! تم ٹھیک تو ہو؟“ اس نے ذرا سی پلکیں جھپکیں تو انہیں اپنے سامنے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

”کیا بات ہے.....؟“ اس کی پریشانی پر ان کی تشویش کوئی ایسی بات نہیں تھی جسے کوئی نام، کوئی رنگ دیا جاتا۔ پھر انہوں نے سوالیہ نظروں سے افشاں کو دیکھا تو وہ چیخ کر بولی۔

”پہلے بیٹی، اب ماں.....“

”کیا مطلب؟“ وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ان کا تو کام ہی یہی ہے، ابھی اچھی بھلی تھی۔ آپ کو دیکھ کر.....“

”بس افشاں بھابھی.....“ وہ ایک دم چیخ پڑی۔

”بڑی بھابھی سمجھ کر میں آپ کا بہت لحاظ کرتی رہی ہوں۔“

”نومیہ.....!“ غزنوی نے ٹوکا تو وہ ان پر چلائی۔

”سمجھا دیں اسے۔ اپنی گھٹیا سوچ کو اپنے ہی تک محدود رکھے۔“

اس کے چلانے پر امی گھبرا کر کچن سے اور چھوٹی اماں اپنے کمرے سے نکل کر آئیں تو انہیں دیکھ کر سامعہ کو گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اتنا لحاظ بھی اس نے یوں کیا تھا کہ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی لیکن بات بڑھ گئی تھی۔

نے ناگواری سے محسوس کیا تھا وہ اس کے وجود سے متنفر تھی۔

وہ کپڑے پھیلانے کے بعد برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی۔ امی کچن میں مصروف تھیں۔ اس نے سوچا کہ نہانے سے پہلے روٹی پکا کر رکھ دے اور ابھی اٹھنے کا ارادہ کر رہی رہی تھی کہ افشاں آ گئی۔ اور اس کے قریب آتے ہی پوچھنے لگی۔

”غزنوی کہاں ہیں.....؟“

”جی.....!“ وہ واقعی حیران ہوئی پھر فوراً سنبھل کر مسکراتی ہوئی بولی۔ ”کمال ہے؟“

آپ کے میاں ہیں، آپ کو معلوم ہونا چاہیے۔“

”وہ صرف میرے میاں نہیں ہیں، یہاں اور بہت لوگ ان پر حق رکھتے ہیں۔“

وہ افشاں کے طنز سے جتانے پر بری طرح تب گئی لیکن ابھی تک وہ براہ راست اس سے ابھی نہیں تھی اور نہ آئندہ کبھی الجھنا چاہتی تھی۔ ابھی بھی خود کو بولنے سے باز رکھا تو افشاں پھر پہلے سوال پر آ گئی۔

”تم نے بتایا نہیں، غزنوی کہاں گئے ہیں؟“

”مجھے نہیں معلوم، ابھی کچھ دیر پہلے میں نے انہیں یہاں سے جاتے ہوئے دیکھا

ضرور تھا لیکن کہاں کا نہیں پتہ۔“ وہ اکتا کر بولی۔

”کیوں اپنی بیٹی کو ان کے ساتھ کرتے ہوئے تم نے پوچھا نہیں کہ وہ اسے کہاں لے جا

رہے ہیں۔“ وہ اس الزام پر تلملا گئی۔

”اول تو میں نے سامعہ کو ان کے ساتھ نہیں بھیجا اور اگر بھیجتی تب بھی یہ پوچھنے کی

ضرورت نہیں تھی کہ وہ اسے کہاں لے جا رہے ہیں۔“

”ظاہر ہے، تمہیں اس سے کیا غرض! تم تو چاہتی ہو کسی بھی طرح غزنوی بس تم ماں بیٹی

کے ساتھ لگے رہیں۔“

افشاں انتہائی چلی سطح پر آ کر بول رہی تھی۔ وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ تبھی غزنوی کی

گا۔ ان کا گھر سلامت نہیں رہے گا۔“

بڑے ابا نے آہستہ سے اس کا سر تھپکا، پھر وہیں سے اونچی آواز میں غزنوی کو پکارا تو وہ جلدی سے اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔ پھر اسے اپنے پیچھے غزنوی کی آواز سنائی دی۔

”جی ابو.....“

”افشاں کو لینے گئے تھے؟“ بڑے ابا نے ان سے پوچھا اور ان کا مختصر جواب آیا۔

”جی.....!“

”کیوں نہیں آئی، کیا کہتی ہے.....؟“

”یہاں آنا نہیں چاہتی۔“ غزنوی کا انداز مجرمانہ تھا۔

”ٹھیک ہے تم اپنے لیے الگ گھر کا انتظام کرو اور اسے وہیں لے جاؤ۔“

بڑے ابا نے پل میں فیصلہ کر دیا۔ اس کے بعد غزنوی کا کوئی احتجاج نہیں سنا۔

☆☆☆

غزنوی نے بجائے یہیں کہیں گھر لینے کے اپنا ٹرانسفر لاہور کروالیا اور افشاں کو لے کر چلے گئے۔ غالباً انہوں نے دورانہ نشی سے کام لیا تھا اور شاید یہ ان کا دانشمندانہ اقدام تھا۔ پھر بھی انہوں نے کسی پر ظاہر نہیں کیا بلکہ یوں جیسے اچانک ٹرانسفر ہو گیا ہو۔ پتہ نہیں یہ ان دونوں کے مابین کیا نانا تھا کہ آپس میں لاکھ ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ لیں، الزام دے لیں لیکن جہاں معاملہ بھری عدالت میں پہنچتا، وہ ان پر بات آنے دیتی نہ وہ اس پر۔ اور شاید اسی لیے دونوں اپنے اپنے مقام پر جے ہوئے تھے۔

بہر حال غزنوی کے جانے سے بہت فرق پڑا تھا۔ یعنی گھر ایک دم خالی خالی لگنے لگا تھا اور کسی کسی وقت اسے یہ خالی پن اپنے اندر محسوس ہوتا۔ غزنوی نے کہا تھا۔ سب کچھ تو تمہاری مرضی سے ہو گیا اور اب وہ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کیا سچ سچ وہ یہی چاہتی تھی۔ نہیں، اس نے ایسا کبھی نہیں چاہا تھا۔ اس وقت سے جب غزنوی نے اس سے شادی کا اعلان کیا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف

رات میں امی کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ اس وقت افشاں، غزنوی کے ساتھ اپنے میکے گئی تھی لیکن واپس یہاں آنے سے اس نے انکار کر دیا ہے، یعنی الگ گھر چاہتی ہے۔ اس کے بعد امی اس پر بگڑنے لگیں کہ اس نے کیوں ہنگامہ کھڑا کیا۔ اسے بھی غصہ آ گیا۔

”پہل اس کی طرف سے ہوئی ہے۔ بلکہ وہ اول روز سے مجھ سے اور سامعہ سے خار کھاتی ہے۔ میرا حوصلہ ہے جو اتنے دن برداشت کرتی رہی۔“

”برداشت تو تمہیں کرنا ہے۔“ امی نے سمجھانا چاہا۔

”کیوں، اس کے باپ کا کھاتی ہوں کیا؟ ہر گز نہیں۔ میں کوئی غلط بات برداشت نہیں کروں گی۔“

امی سمجھ گئیں۔ اس وقت وہ ان کی کوئی بات نہیں سنے گی، اس لیے خاموشی اختیار کر لی لیکن اندر ہی اندر پریشان ہو گئی تھیں۔ حالانکہ جانتی تھیں کہ قصور اس کا نہیں ہے پھر بھی انجانے خدشوں کو دبا نہیں سکیں۔

اگلے روز بڑے ابا نے اسے بلا بھیجا اور اس کے پوچھنے پر اس نے اول روز افشاں کا رویہ، اس کے اندیشے اور طنز ایک ایک بات کہہ سنائی۔ آخر میں کہنے لگی

”میں اس سے زیادہ ہمتیں برداشت نہیں کر سکتی بڑے ابا اور خصوصاً مجھے نشانہ اس لیے بنایا گیا کہ میں اکیلی ہوں۔ ورنہ غزنوی کا رویہ تو سب کے ساتھ ایک سا ہے۔ حرا، سیما، میں۔ لیکن حرا اور سیما کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”تمہیں بھی کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ بڑے ابا اس کا مطلب سمجھ کر بولے۔ ”جس حساب سے تم اپنے آپ کو اکیلا کہہ رہی ہو، وہ ٹھیک ہے لیکن بیٹا! ابھی میں زندہ ہوں۔“

”بڑے ابا.....!“ اس کی آنکھیں یک لخت جل تھل ہو گئیں۔ بے اختیار آگے بڑھ کر بڑے ابا کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگا لیے۔

”مجھے انصاف نہیں چاہیے بڑے ابا۔ انصاف کریں گے تو غزنوی کا بہت نقصان ہو

پر چڑھ گئی اور بچی کو اپنی گود میں لینے کی ضد کرنے لگی۔

”چندا!.....! ابھی تو تم خود اتنی سی ہو۔“ حرا نے بہت احتیاط سے بچی کو سامعہ کی گود میں

ڈالا۔ پھر اس سے پوچھنے لگی۔

”بڑی اماں نیچے ہیں کیا.....؟“

”ہاں، میں آئی تو امی کے پاس بیٹھی تھیں۔“ اس کا دھیان سامعہ کی طرف تھا کہ کہیں

وہ زیادہ پیار آنے پر بچی کو نوچ نہ لے۔ اس لیے حرا کی بات کا جواب سرسری انداز میں دیا۔

”ماما! گڑیا بولتی ہے؟“ سامعہ اس سے پوچھنے لگی۔

”نہیں۔ ابھی صرف روتی ہے۔“

”میں تو نہیں روتی.....“ سامعہ نے معصومیت سے اپنی تعریف کی تو حرا پیار سے اس کا

گال چھو کر بولی۔

”آپ تو اچھی بچی ہوناں!“

”گڑیا بھی اچھی ہے، ہے ناں ماما!“

”ہاں بیٹا! لاؤ اب اسے مجھے دے دو۔“

اسے بس یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں سامعہ اسے لڑھکانہ دے۔ زبردستی اس کی گود سے

اٹھالیا۔

”اسے بھوک بھی لگی ہوگی۔ میں اس کی فیڈر بنا لاؤں۔“ حرا گڑیا کی طرف سے

اطمینان سے ہو کر اٹھ گئی۔ پھر جاتے جاتے پوچھنے لگی، چائے پیوگی؟“

”نہیں.....“ اس نے منع کر دیا۔ پھر کچھ دیر بعد جب حرا بچی کو دودھ پلانے میں

مصرف تھی تو فون کی بیل پر اسے اٹھنا پڑا۔ دوسری طرف غزنوی تھے۔ اس کے ہیلو کہنے پر ہی

پہچان کر بولے۔

”نومیہ! کیسی ہو.....؟“

چل رہی تھی۔ سب یہی سمجھتے تھے کہ وہ اپنی شادی کی ناکامی سے خوفزدہ ہے، اصل المیہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆☆☆

پھر کتنا بہت سارا وقت گزر گیا، حرا کے آنگن میں پہلا پھول بیٹی کی صورت میں کھلا تو بڑی اماں کو غزنوی کے سونے آنگن کا کچھ زیادہ ہی احساس ہونے لگا۔ انہیں لاہور گئے ہوئے ایک سال ہو گیا تھا۔ مبینے میں ایک دو بار بڑی اماں سے فون پر بات کر لیتے تھے اور آنے کا وعدہ بھی لیکن آتے نہیں تھے۔ حالانکہ لاہور کوئی اتنا دور بھی نہیں تھا۔ چاہتے تو کسی بھی ویک اینڈ پر آ سکتے تھے۔ یعنی اگر کام زیادہ اور چھٹی نہ ملنے کا مسئلہ تھا تو..... لیکن وہ پتہ نہیں کیا سوچے ہوئے تھے۔ عید پر بھی نہیں آئے۔ البتہ افشاں کو بھیج دیا تھا۔ جو کہ سارا وقت تو اپنے میکے میں رہی بس جاتے سے کچھ دیر کو ملنے چلی آئی تھی اور جب غزنوی کا فون آنے پر بڑی اماں نے ان سے شکایت کی تو وہ بس اسی قدر بولے تھے۔

”اپنی مرضی کی مالک ہے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

اور اسے افسوس ہوتا تھا کہ غزنوی کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔ اپنے طور پر تو بڑی اماں نے ان کے لیے اچھی لڑکی تلاش کی تھی جیسے اس کے لیے بڑے ابا نے اچھا لڑکا، اچھا گھر یعنی اپنا پورا اطمینان کر لیا تھا لیکن سب قسمت کی بات ہے اور شاید کاتب تقدیر نے دونوں کے مقدر ایک ہی وقت میں رقم کیے تھے۔ وہ سوچتی تو اسے دکھ ہوتا اور افشاں پر افسوس اور کہیں کہیں اس کے اندر بحرمانہ سا احساس جاگتا۔ خصوصاً اس وقت جب بڑی اماں غزنوی کی دوری کو محسوس کرتے ہوئے بے اختیار کہہ جاتیں۔

”کیا یہی اچھا ہوتا جو اپنی نومیہ شادی کے لیے ہامی بھر لیتی۔“

اس وقت وہ امی سے یہی کہہ رہی تھیں۔ وہ چپ چاپ سامعہ کو..... لے کر اوپر چلی

آئی۔ حرا اپنی بچی میں مصروف تھی۔ اور سامعہ کو وہ چھوٹی سی گڑیا بہت اچھی لگتی تھی۔ فوراً حرا کے بیڈ

”بالکل خیریت سے۔“ اس نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ بول پڑے۔

”اور یقیناً میری خیریت تم کو نیک مطلوب ہوگی لیکن تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔“ وہ تہقہ لگا کر ہنس پڑی۔

”ظاہر ہے، میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔“ پھر پوچھنے لگی۔ ”بڑی اماں کو بلاؤں؟“

”کیوں، تم بات نہیں کرنا چاہتیں۔“

”میں نے یہ کب کہا؟“

”سامعہ کیسی ہے؟“ وہ ان سنی کر کے بات بڑھا گئے۔

”ٹھیک ہے۔“

”اور تم، میرا مطلب ہے کیا کر رہی ہو آج کل؟“ کس قدر رسمی گفتگو تھی جیسے بولنے میں احتیاط برتی جا رہی ہو۔

”بی اے کا امتحان دیا ہے۔ رزلٹ کا انتظار کر رہی ہوں۔ اس کے بعد اگر بڑے ابا نے اجازت دی تو جاہ کروں گی۔“

اپنے تئیں اس نے تفصیل سے جواب دے کر مزید سوال کی گنجائش نہیں چھوڑی، لیکن سوال موجود تھا۔

”جاہ کیوں.....؟“

”کچھ نہ کرنے سے تو کچھ کرنا بہتر ہے۔“

”یہ تو ہے لیکن میں نے تو کچھ اور سنا ہے۔“ انہوں نے تائید کرتے ہوئے کہا تو اس نے حیران ہو کر فوراً پوچھا۔

”میرے بارے میں؟“

”ہوں.....“ انداز سوچتا ہوا تھا۔

”کیا۔ کیا سنا ہے؟“

”ہے.....؟“

وہ حیران تھی۔ اس سوال پر مزید حیران ہوئی اور پوچھنا چاہتی تھی کہ ان سے کس نے کہا لیکن وہ پہلے ہی منع کر چکے تھے۔ اس لیے اپنے آپ سوچنے میں لگ گئی۔ قدرے توقف سے انہیں ٹوکنا پڑا۔

”تم نے جواب نہیں دیا۔“

”آپ کیا سننا چاہتے ہیں.....؟“ اپنی سوچوں سے نکل کر اس کا سارا دھیان ان کی طرف منتقل ہو گیا۔

”ہاں، میں تمہارے منہ سے ”ہاں“ سننا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے جانے کس بنا پر کہا وہ اپنے آپ نتیجہ اخذ کر کے بولی۔

”اس کا مطلب ہے افشاں کو ابھی بھی میری طرف سے خطرہ ہے۔“

”تو تم کیوں اس کے لیے خطرہ بنی رہنا چاہتی ہو.....“ وہ بری طرح سلگ کر بولے۔

”میں کسی کے لیے خطرہ نہیں ہوں۔ سمجھے آپ!“ وہ ان سے زیادہ سلگ کر چیخ پڑی۔

”شٹ اپ نومیہ! پہلے الٹا سیدھا بولتی ہو، پھر چلاتی ہو۔ کیا میں نے تم سے کہا کہ افشاں کو تم سے کوئی خطرہ ہے۔“

”پھر آپ کو میری شادی سے کیا دلچسپی ہے.....؟“

”میری طرف سے جہنم میں جاؤ.....“ انہوں نے فون ٹیخ دیا تو بے حد تملتا کر اس نے بھی تقلید کی اور پیر پختی ہوئی حرا کے پاس آئی تو وہ اس کے سرخ چہرے کو دیکھ کر بولی۔

”غرنوی بھائی کا فون تھا؟“

”تمہیں کیسے پتہ.....؟“ اس کا بقیہ غصہ اب حرا پر ہی اترنا تھا۔

”تمہارا چہرہ بتا رہا ہے۔ انہی کی باتوں پر تم ایسے تملاتی ہو۔ ویسے انہوں نے کہا کیا

ہے.....؟“ حرا نے کچھ ڈرتے ڈرتے پوچھا تو وہ چیخ کر بولی۔

”جہنم میں جاؤ.....“

”ہائیں، میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟“

”تم نہیں، وہ مجھ سے کہہ رہے تھے۔ بڑے آئے کہیں سے۔“ وہ بڑبڑانے

لگی۔ ”وہاں بیٹھ کر بھی چین نہیں ہے۔ میری شادی، میری شادی۔ پتہ نہیں انہیں کیا تکلیف

ہے۔ جیسے ان کے سر پر بوجھ بنی بیٹھی ہوں۔“

پھر ایک دم حرا کو دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”ان سے کس نے کہا ہے کہ میری شادی ہو رہی ہے؟“

”پاگل ہو تم، وہ ایسے ہی تم سے اگلوانا چاہ رہے ہوں گے کہ آیا تم نے شادی نہ کرنے کی

قسم توڑی کہ نہیں۔“

خلاف توقع حرا کی بات فوراً اس کی سمجھ میں آگئی اور یقین بھی کر لیا۔

”ہاں یہی بات ہوگی۔“

”بالکل یہی بات ہے اور اب کم از کم مجھے تو بتادو کہ تمہارے ارادے کیا ہیں؟“

”بس اب تم میرا دماغ خراب نہ کرو۔“ وہ ٹوکتی ہوئی بولی اور سامعہ کو لے کر نیچے چلی

آئی۔

☆☆☆

پھر بہت زیادہ فراغت سے اکتا کر اس نے زلٹ آنے سے پہلے ہی بڑے ابا سے

جواب کرنے کی اجازت لے لی۔ گو کہ وہ بالکل بھی اس کی جاب کے حق میں نہیں تھے لیکن پتہ نہیں

کیوں اس کی بات ٹالی نہیں جاتی تھی۔ اس کے سامنے خود کو بے بس محسوس کرتے تھے۔ یہاں

بھی تھوڑی سی پس و پیش کے بعد اجازت دے دی۔ لیکن زیادہ دور جانے سے منع کر دیا۔ یعنی

قریبی اسکولوں میں اپلائی کر سکتی تھی۔ اور وہ خود بھی یہی چاہتی تھی کہ سارا دن گھر سے باہر نہ رہنا

پڑے۔ بہر حال اجازت ملتے ہی اس نے سب سے پہلے سامعہ کے اسکول میں بات کی اور اتفاق

سے وہیں اس کا تقرر ہو گیا۔ یوں سامعہ کو لانے لے جانے کا مسئلہ بھی آپ ہی آپ حل ہو گیا۔

اور شاید وہ سوچ چکی تھی کہ اسے زندگی اسی طرح گزارنی ہے۔ اس لیے خاصی مطمئن

نظر آتی تھی جبکہ باقی سب اس کے لیے فکر مند تھے۔ اور وہ محسوس بھی کرتی تھی لیکن جہاں کہیں کسی کا

تفکر ظاہر ہوتا یعنی وہ پہاڑی زندگی کیسے گزارے گی تو وہ ہتھ سے اکھڑ جاتی۔ اس کے باوجود

بڑے ابا اس کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ جیسا کہ انہوں نے امی سے کہا تھا کہ وہ ان کی ذمہ

داری ہے۔ بس یہ ہے کہ اب وہ جلد بازی میں فیصلہ نہیں کریں گے، اور اس بات کو چار سال تو ہو

گئے تھے۔ یعنی اس نے گریجویشن کر لیا تھا اور شاید بڑے ابا اسی انتظار میں تھے۔ مزید دو تین ماہ کا

عرصہ انہوں نے قصد اخاموشی سے گزارا تا کہ وہ اپنا جاب کا شوق بھی پورا کر لے۔ اس کے بعد امی

کو بلا کر کہنے لگے۔

”نومیہ نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ اس نے شادی نہ کرنے کی یہی وجہ بتائی تھی کہ وہ

پڑھنا چاہتی ہے اور اب جب کہ وہ تعلیم ختم کر چکی ہے تو میں سمجھتا ہوں اس کی شادی کر دینی

چاہیے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“ امی کے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی تھی۔

”میں خود یہی چاہتی ہوں، لیکن.....“ اچانک انہیں نومیہ کا خیال آیا کہ وہ تو سرے

سے یہ ذکر سننا ہی نہیں چاہتی۔

”لیکن کیا.....؟“ بڑے ابا سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”نومیہ نہیں مانتی، شادی کا نام سنتے ہی ہتھ سے اکھڑ جاتی ہے۔“ امی بتا کر فکر مند نظر

آنے لگیں تو بڑے ابا کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔

”آرام سے بات کرو، مان جائے گی۔“

”کوئی لڑکا.....“ بڑے ابا اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”ہمارے آفس میں ہی

کام کرتا ہے۔ میں کوئی آٹھ دس سالوں سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ اچھا، مخنتی آدمی ہے۔ بیوی کا

اور امی کے لیے یہی بہت تھا کہ وہ ہٹ دھرمی چھوڑ کر سچے پر آمادہ ہوئی تھی۔ اور اسے اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچنا تھا بلکہ بڑے ابا کو ان کے ارادے سے کیسے باز رکھا جائے۔ اگلے تین دن حقیقتاً اس کے بہت پریشانی کے عالم میں گزرے۔ ہر وقت بددھڑکا بھی لگا رہا کہ کہیں اسی وقت بڑے ابا اس کو بلا کر اس کا جواب نہ مانگ لیں کہ اس کا جواب وہی تھا، شادی کرنی ہی نہیں۔

☆☆☆

اس وقت وہ اسکول سے لوٹی تھی۔ کھانے کے بعد سامعہ کساتھ لے کر سونے کے لیے لیٹی تو گزشتہ تین روز سے مسلسل سوچنے کے باعث اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ سامعہ نے کوئی بات کی تو اسے بری طرح جھڑک کر سونے کے لیے کہا اور زور زور سے تھکنے لگی تو امی ٹوک کر بولیں۔

”کیوں زبردستی کر رہی ہو بچی کے ساتھ؟ نہیں سو رہی تو چھوڑ دو.....! آؤ سامعہ میرے پاس.....“

امی نے بلایا تو سامعہ اسے دیکھنے لگی۔

”جاؤ لیکن تنگ نہیں کرنا امی کو.....“ اس نے اجازت دینے کے ساتھ تنبیہ بھی کی۔ تو سامعہ جلدی سے پلنگ سے نیچے اتر گئی۔ تب امی اٹھتی ہوئی اس سے بولیں۔

”میں اسے اوپر لے جا رہی ہوں۔ غزنوی آیا ہوا ہے۔ پوچھ رہا تھا اس کا.....“ وہ ذرا سا چونکی، پھر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

”کب آئے غزنوی.....؟“

”صبح تمہارے جانے کے کوئی گھنٹہ بھر بعد۔“

”اور افشاں بھابھی.....؟“

”وہ بھی لیکن یہاں نہیں آئی۔ سیدھی اپنے میکے میں ازی ہے۔ میرا خیال ہے بچہ ہونے والا ہے۔ ڈیلیوری کے لیے آئی ہے۔“ امی نے بتایا تو وہ کچھ چڑ کر بولی۔

انتقال ہو چکا ہے۔ دو بچے ہیں، اتنے چھوٹے بھی نہیں ہیں کہ نومیہ کو سنبھالنے پڑیں۔“

امی نے کچھ مایوسی سے سر جھکایا تو کہنے لگے۔

”یہ صحیح ہے کہ نومیہ کی عمر اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن وہ ایک بچی کی ماں ہے۔ تم میری بات

سمجھ رہی ہونا.....!“

”جی.....“

”تو جاؤ! اسے بھی سمجھاؤ اور یہ بھی کہہ دینا کہ اب میں اس کا کوئی عذر نہیں سنوں گا۔“

بڑے ابا کے حتمی انداز پر امی چپ چاپ نیچے چلی آئیں۔ پھر انہوں نے سوچا کہ ٹھیک تو ہے، قسمت بار بار تو مہربان نہیں ہوتی اور انہوں نے نومیہ سے بھی یہی کہا۔

”غزنوی گھر کا لڑکا تھا۔ اس لیے اس نے تمہارے طلاق یافتہ اور بچی کی ماں ہونے کو

اہمیت نہیں دی تھی لیکن تم نے اسے ٹھکرا دیا۔ اب اس جیسا کہاں ملے گا۔“

امی نے جس انداز سے بات شروع کی، اس سے وہ ٹھکی ضرور لیکن فوراً کچھ نہیں

بولی۔ بلکہ باقاعدہ ان کی طرف دیکھنے لگی کہ اب آگے وہ کیا کہتی ہے اور وہ کہنے لگیں۔

”تمہارے بڑے ابا اب تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ کہہ رہے تھے، تم نے جتنا

پڑھنا تھا پڑھ لیا، اب وہ کوئی عذر نہیں سنیں گے۔“

”وہ.....“ حسب عادت وہ کہنے جا رہی تھی کہ وہ کون ہوتے ہیں لیکن فوراً ہونٹ بھیج

گئی۔ پھر سنبھل کر کہنے لگی۔ ”میں کوئی عذر نہیں تراشوں گی۔ آپ صاف لفظوں میں بڑے ابا سے

کہہ دیجئے کہ مجھے شادی کرنی ہی نہیں۔“

”وہ انکار سننا ہی نہیں چاہتے۔“ امی صاف اپنا دامن بچا کر بات کر رہی تھیں۔ اور وہ

سب سے لڑکتی تھی بڑے ابا سے نہیں۔ جب ہی پریشان ہو گئی۔

”پھر میں ان سے کیا کہوں.....؟“ امی نے پوچھا تو وہ جزبہ ہو کر بولی۔

”ابھی کچھ نہیں کہیں، میرا مطلب ہے میں سوچ کر بتاؤں گی۔“

ہوئی بویس۔ ”لو! میں باتوں میں لگ گئی۔ ذرا جھانک کر دیکھو، غزنوی ٹیکسی لے آیا۔“

”آتے ہی ہوں گے، آپ نیچے تو چلیں.....“ وہ بڑی اماں کو لے کر دوبارہ نیچے آ گئی۔ کچھ دیر بعد غزنوی ٹیکسی لے آئے تو بڑی اماں ان کے ساتھ چلی گئیں اور اس نے کچن کا رخ کیا۔

فطری طور پر سب کا دھیان افشاں کی طرف لگا ہوا تھا کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ رات دیر تک وہ بھی انتظار کرتی رہی لیکن ہاسپٹل سے کوئی فون نہیں آیا تھا۔ پھر صبح اٹھتے ہی اس نے امی سے پہلا سوال یہی کیا۔

”بڑی اماں کا فون آیا تھا؟“

”نہیں، ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔“ امی بھی جیسے اسی انتظار میں تھیں۔ ”ایسا لا پرواہ تو نہیں ہے غزنوی۔ کم از کم فون کر کے کچھ خبر تو دیتا۔“

”ضروری نہیں سمجھا ہوگا.....“

وہ کہتی ہوئی منہ دھونے چل دی۔ اس کے بعد جلدی جلدی ناشتہ بنایا، پھر پہلے سامعہ کو اسکول کے لیے تیار کر کے امی کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے ناشتہ کرائیں۔ اس کے بعد خود تیار ہو کر آئی اور ابھی چائے کا پہلا گھونٹ لیا تھا کہ حرا بہت بوکھلائی ہوئی آئی اور باری باری امی اور اسے یوں دیکھنے لگی جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کیا کہے۔ تبھی چھوٹی اماں کمرے سے نکلیں اور انہیں دیکھتے ہی حرا بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔

”ہائیں، یہ صبح صبح.....!“ حرا بری طرح کانپ رہی تھی۔ چھوٹی اماں ٹھٹک گئیں اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ چائے کا کپ رکھ کر ان کے قریب آئی اور حرا کا بازو دہلا کر پوچھنے لگی۔

”کیا بات ہے حرا.....؟“

”وہ افشاں بھا بھی۔“

”کیوں لاہور میں ڈیلیوری نہیں ہو سکتی تھی؟“

”کیوں نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہاں اس کی دیکھ بھال کون کرتا۔“

”بیچارے غزنوی! اب ہر سال.....“ امی کے گھورنے پر اس نے آنکھوں پر بازو رکھ

لیا۔

”تم بھی چلو.....!“ امی نے جاتے جاتے کہا لیکن وہ ان سنی کر کے کروٹ بدل گئی۔

شام میں سو کر اٹھی، تب اطمینان سے اوپر آئی لیکن اس وقت غزنوی بہت غلت میں تھے۔ اس کے سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی کیسی ہو کہا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر سیڑھیاں اتر گئے۔ تو اس نے کچھ حیران ہو کر انہیں جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر اندر آئی تو بڑی اماں کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ اپنے آپ بڑبڑا رہی تھیں۔ وہ سمجھ گئی غزنوی سے کسی بات پر تکرار ہوئی ہے۔ قصداً انجان بن کر ان کے پاس بیٹھتی ہوئی بولی۔

”غزنوی کب آئے؟ میں نے ابھی انہیں دیکھا ہے۔“

”صبح آیا ہے۔“ بڑی اماں کے انداز میں ناگواری ظاہر کر رہی تھی کہ ان کا ذہن کچھ دیر پہلے کی صورت حال میں الجھا ہے۔ اور پتہ نہیں صورت حال کیا تھی۔ اسے جاننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ البتہ بڑی اماں کی دلجوئی ضرور منظور تھی۔ جیسی لہجے کو خوشگوار بنا کر بولی۔

”لگتا ہے آپ غزنوی سے ناراض ہیں۔ کیوں بڑی اماں! اتنے دنوں بعد تو آئے ہیں

وہ.....“

”میرے لیے آیا ہے، اپنی جو رو کے ساتھ آیا ہے۔ اور ڈھٹائی دیکھو اب مجھے کہہ رہا

ہے اسپتال چلو۔“

”اسپتال کیوں؟“

”خیر سے دلہن کا بچہ ہونے والا ہے۔“

بس بڑی اماں کا غصہ اور ناراضگی اتنی ہی تھی۔ ایک دم سے لہجہ بدل گیا، پھر فوراً اٹھتی

”سب پتہ ہے اے آپ فکر نہیں کریں۔“

”کیسے فکر نہیں کروں۔ اول تو میں تمہارے لاہور جانے کے حق میں بھی نہیں

ہوں۔ بس اب اپنا تبادلہ یہیں کروالو۔“

امتا کے ہاتھوں مجبور بڑی اماں نے شاید قبل از وقت یہ بات کہہ دی۔

”یہ خوب کہی آپ نے اس کا مطلب ہے اس گھر میں صرف میری بیوی کے لیے

گنجائش نہیں تھی۔ اب وہ نہیں ہے تو میں آسکتا ہوں۔“

غزنوی کے تاسف بھرے طنز سے بڑی اماں شپٹا گئیں تو ان کی طرف سے وہ جواب

دینے کو چل گئی لیکن فوراً ہونٹ بھینچ کر خود کو بولنے سے باز رکھا۔

”نہیں اماں! اب میری یہاں واپسی ممکن نہیں ہے۔ اور میں بچے کو بھی خود سے الگ

نہیں رکھ سکتا۔“

ان کے حتمی انداز پر بڑی اماں آزرده ہو گئیں تب وہ بولنے سے باز نہیں رہ سکی۔

”ٹھیک تو ہے بڑی اماں! یہ صرف ان کا بچہ ہے اور کسی کا کوئی حق نہیں ہے اس پر۔“

اس کی بات پر انہوں نے دھیان ہی نہیں دیا اور اٹھ کر جانے لگے تو بڑی اماں پکار کر

بولیں۔

”سنو بیٹا! میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”کہاں.....؟“ وہ سمجھے نہیں۔

”لاہور! اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو.....“

اور وہ ہرگز بھی اعتراض نہیں کر سکتے تھے۔ یوں بڑی اماں ان کے ساتھ چلی

گئیں۔ صرف پوتے کی خاطر نہیں بلکہ انہیں غزنوی کا خیال بھی تھا۔ اور ظاہر ہے وہ ماں

تھیں۔ ایسے دکھ کے عالم میں بیٹے کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھیں۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ بڑے ابانے جو اس کی شادی کا ذکر چھیڑا تھا تو

”ارے ہاں! کیا ہوا بیٹا یا بیٹی.....؟“ وہ کچھ جلدی بول گئی۔ اور کچھ غلط تو نہیں بولی

تھی، پھر بھی اسے لگا جیسے کوئی غلطی کر گئی ہے۔ ایک دم خاموش ہو کر حرا کو دیکھنے لگی تو وہ لرزتی ہوئی

آواز میں بولی۔

”بیٹا ہوا ہے لیکن افشاں بھابھی چلی گئیں۔“

”ہائیں!“ امی اور چھوٹی اماں کے ہونٹوں سے ایک ساتھ آہ بلند ہوئی اور دونوں

خواتین ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگیں، جبکہ وہ اپنی جگہ گم ضم کھڑی تھی۔

☆☆☆

وہی بات کہ مرنے والے کے ساتھ کوئی مر نہیں سکتا، اور دنیا کا کاروبار اسی طرح چلتا

رہتا ہے۔ گو کہ افشاں اس گھر میں نہیں رہتی تھی لیکن اس گھر سے اس کا ناتا تھا۔ بڑی اماں بہت چاؤ

سے اسے بیاہ کر لائی تھیں۔ اور اس کے نامناسب رویے کے باوجود اس سے محبت کرتی تھیں۔ اور

شاید ان کی محبتوں کے عوض ہی افشاں جاتے جاتے اپنا بیٹا ان کی جھولی میں ڈال گئی تھی۔ لیکن

غزنوی جانے کیسے اتنے کھنور بن گئے۔ جب واپس لاہور جانے لگے تو بڑی اماں کی اتنی منتوں

کے باوجود بھی بچے کو ان کے پاس چھوڑنے کو تیار نہیں ہوئے۔ حالانکہ چند دن کا بچہ ان کے لیے

پر اہم ہی ہو سکتا تھا، پھر بھی وہ نہیں مانے۔

اس وقت اتفاق سے وہ بھی وہیں موجود تھی اور بہت خاموشی سے ماں بیٹے کی تکرار سن

رہی تھی۔

”تم تو صبح آفس چلے جاؤ گے، پھر بچے کا کیا ہوگا.....“ بڑی اماں جانے کتنی باریہ سوال

کر چکی تھیں اور ان کا ایک ہی جواب تھا۔

”میرے پاس ملازم موجود ہے۔“

”ملازم کیا دیکھ بھال کرے گا اس کی۔ اسے تو یہ بھی نہیں پتہ ہوگا کہ اتنے بچے کو دودھ

کیسے پلایا جاتا ہے۔“

بڑی اماں پورے چار مہینے غزنوی کے پاس رہ کر آئی تھیں۔ اس دوران بڑے ابا دوبارہ ان کے پاس ہو آئے اور دونوں ہی غزنوی کو یہاں آنے پر آمادہ نہیں کر سکے۔ پتہ نہیں انہوں نے کیا سوچ لیا تھا۔ بہر حال یہاں آ کر بھی بڑی اماں ان کے لیے فکر مند رہتی تھیں۔ زیادہ بچے کا خیال تھا۔ ان کی اتنی منتوں کے باوجود بھی غزنوی نے بچے کو ان کے ساتھ نہیں بھیجا حالانکہ وہ ان کی گود سے مانوس ہو گیا تھا۔ اور شاید وہ لاہور گئی ہی اس مقصد سے تھیں۔ اب ناکامی کی صورت میں اس وقت کو پچھتا رہی تھیں۔

”نہ جاتی تو اچھا تھا۔ بچہ شروع ہی سے نوکر کا عادی ہو جاتا اب کیسے گھبراتا ہو گا۔ غزنوی کو دیکھو، کیسا کٹھور ہو گیا ہے۔ ذرا احساس نہیں۔ میرا خیال کیا نہ باپ کا۔ صاف کہہ دیا میرا بچہ ہے آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں..... اس کا بچہ ہمارا تو کچھ نہیں.....“

بڑی اماں آبدیدہ ہو کر رونے لگیں۔ پوتے کی محبت انہیں زیادہ رلا رہی تھی۔ ”روتی کیوں ہیں بڑی اماں! صبر کریں۔ دیکھئے گا چار دن میں تارے نظر آ جائیں گے غزنوی کو، تو خود ہی بچے کو لے کر بھاگے آئیں گے۔“ اس نے بڑی اماں کو گلے لگا کر تسلی دی۔

”ارے تم نہیں جانتیں! وہ بھی تمہاری طرح اپنے نام کا ایک ہے۔“ بڑی اماں نے ساتھ ساتھ اسے بھی گھسیٹ لیا تو وہ جزبزی ہو کر ان سے الگ ہو گئی۔ حرا پر نظر پڑی تو وہ نیلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر بنس رہی تھی۔ جس پر وہ مزید سلگ کر بڑبڑانے لگی تو حرا ہنسی روک کر بڑی اماں کی تائید کرتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک کہا بڑی اماں آپ نے۔ یہ بھی بے حس ہے اور غزنوی بھائی بھی۔ بچوں کا بھی کوئی خیال نہیں۔“

”کیوں خیال نہیں! کیا کمی دے رہی ہوں میں سامعہ کو بتاؤ؟“ وہ ایک دم اٹھ کر حرا کے سر پر یوں جا کھڑی ہوئی جیسے ابھی اس پر جھپٹ پڑے گی۔

”فؤہ! تم تو لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتی ہو۔“

”غزنوی کو تم لوگوں نے میری چڑ بنا دیا ہے.....“ وہ ٹوکتے ہوئے سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی لیکن حرا نے اس کا ہاتھ کھینچ کر دوبارہ بٹھا دیا اور کہنے لگی۔

”تم ہمیشہ درمیان میں بات چھوڑ دیتی ہو۔ اس لیے اب تک کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہو سکا۔ مجھے بتاؤ! آخر تم چاہتی کیا ہو.....؟“

”پتہ نہیں! مجھے خود نہیں پتہ.....“ وہ عاجزی سے بولی اور پھر ایک دم ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی تو حرا پریشان ہو گئی۔

”ارے نومیہ! دیکھو رومت۔ میری بات سنو.....“

حرا اسے رونے سے باز رکھنے کے لیے کیا کیا بولے لگئی۔ اور اس نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں رگڑیں۔ پھر اس سے پہلے کہ حرا کچھ کہتی فوراً اٹھی اور بھاگتی ہوئی نیچے آ گئی۔

اس رات بالکل غیر ارادی طور پر وہ خود سوچ رہی تھی کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ اور تب اس پر ادراک ہوا کہ زندگی کی ان بقی راہوں پر اسے محبت کی چھایا کی آرزو ہے۔

وہ ضرورتاً کسی کا ہاتھ نہیں تھام سکتی۔ کیونکہ کسی بھی شے کی ضرورت ہر وقت نہیں رہتی۔ سائبان کی بھی نہیں۔ جب تک سر پر دھوپ اور بارش نہ ہو سائبان کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور اب تو وہ دھوپ اور بارش میں چلنے کی عادی ہو گئی تھی۔ البتہ تنہا چلتے ہوئے کہیں کہیں اس کا دل چاہتا کوئی اسے محبت سے پکارے۔

وہ رُک کر مڑ کر دیکھے، پھر اپنی طرف بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام کر چلے تو صرف محبت کا احساس ہو۔ اور یہاں سب ظالم تھے یا انجان کہ پہلے بھی دل کی بستی بننے سے پہلے اجاڑ دی اور اب بھی صرف اس کی ضرورت کا خیال۔ نہیں! جب اس کے لیے محبت نہیں تو اسے بھی کسی کی ضرورت نہیں۔ زندہ رہنے کے لیے کوئی بہانا چاہیے تو اس کے پاس سامعہ ہے ناں.....! آخر میں وہ سامعہ کے لیے سوچ رہی تھی۔

ان کی باتوں سے ہی ظاہر ہوتا ہے۔

”غزنوی پہلے ایسے نہیں تھے.....“ حرا کی بات اس کے دل میں ترازو ہو گئی تھی۔

اگلے دن اسکول سے آکر اس نے حسب معمول سامعہ کو کھانا کھلا کر سلا دیا اور جب نماز کے بعد امی بھی کچھ دیر سونے کی غرض سے لیٹ گئیں۔ تب وہ لابی میں سے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھی اور غزنوی کے آفس کے نمبر سوچ سوچ کر ڈائل کرنے لگی۔ دوسری ٹیل پر ریسپور اٹھانے کے ساتھ اجنبی آواز سنائی دی تو اس نے پہلے نمبر کی تصدیق کی پھر غزنوی سے بات کرانے کو کہا۔

”ہیلو کون.....؟“ قدرے توقف سے خاصے مصروف انداز میں غزنوی نے پوچھا تو وہ جلدی سے بولی۔

”میں ہوں نومیہ.....!“

”کیسی ہو.....؟“ لہجہ ظاہر کر رہا تھا کہ اس کی آواز سنتے ہی دوسری مصروفیت ترک کر دی۔

”ٹھیک ہوں۔ آپ کیسے ہیں.....؟“

”کیسے یاد کیا.....؟“ وہ اس کا سوال نظر انداز کر گئے تو اس نے بھی کوئی تمہید نہیں باندھی۔

”مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے۔“

”ہوں.....“

”کیا آپ میری وجہ سے یہاں نہیں آرہے.....؟“

اس کے سیدھے سادے سوال پر وہ کچھ رک کر بولے۔

”یہ تم سے کس نے کہا.....؟“

”کہا کسی نے نہیں لیکن سب کا یہی خیال ہے۔“

”تم نے غلط بات کیوں کی.....؟“

”میں نے کوئی غلط بات نہیں کی۔ کیوں بڑی اماں.....!“ حرا نے بڑی اماں کی تائید چاہی۔

”جانے دو بیٹی! یہاں سب اپنی مرضی کے مالک ہیں.....“

بڑی اماں کہتی ہوئی نماز کے لیے اٹھ گئیں تو حرا نے اس سے ناراضگی کا اظہار بلکے سے سر جھٹک کر کیا۔ تب وہ اپنے رویے پر نادم ہو کر بولی۔

”سوری! مجھے تم سے اس طرح بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ اتنی جلدی آپ سے باہر ہو جاتی ہوں۔ اب یہ بھی تو ٹھیک نہیں ہے نا کہ بات کسی کی ہو، گھما پھرا کر مجھ پر آ جاتی ہے۔ تم بتاؤ! غزنوی کے یہاں نہ آنے میں میرا دوش ہے۔ انہوں نے بچے کو نہیں بھیجا تو اس میں بھی میرا قصور ہے کیا؟“

”مجھے نہیں پتہ، میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ غزنوی بھائی پہلے ایسے نہیں تھے.....“ حرا نے دامن بچاتے ہوئے کہا تو وہ افسردگی سے بولی۔

”تم پھر مجھے الزام دے رہی ہو۔ یعنی غزنوی بھائی میری وجہ سے ایسے ہو گئے ہیں۔“

”یہ میں نے کب کہا.....!“

”کہا نہیں لیکن تمہارا مطلب یہی ہے اور شاید سب یہی سمجھتے ہیں۔“ وہ بہت دل گرفتہ ہو گئی تھی۔

حرا نے چونک کر دیکھا، پھر اس کا ہاتھ تھامنا چاہا لیکن وہ اٹھ کر نیچے آ گئی۔

☆☆☆

رات میں سامعہ کو ہوم ورک کروانے بیٹھی تو بار بار اس کا دھیان ہٹ جاتا۔ کبھی حرا کی باتوں کی طرف اور کبھی بڑی اماں کی طرف۔ اور وہ اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کرنے لگی، یعنی سب اسے قصور وار سمجھتے ہیں۔ بے شک اس کے گھر پر صاف لفظوں میں نہ کہیں، پھر بھی

”اور تم! تم کیا سمجھتی ہو.....؟“

”میری بات چھوڑیں۔ بس آپ میرے سوال کا جواب دیں۔ کیوں یہاں نہیں آنا

چاہتے؟“

”وجہ تم نہیں ہونو میہ! اگر سب کا یہ خیال ہے تو غلط ہے۔ یہاں میری جاب ہے اور میں بہت اچھی طرح سیٹل ہو چکا ہوں۔“

انہوں نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ کچھ عاجزی سے بولی۔

”میں یہ سب نہیں جانتی۔ بس آپ یہاں آجائیں اور اگر نہیں آئے تو میں بھی یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

”ک۔ کیا مطلب.....؟“ وہ بوکھلا گئے۔ ”تم کہاں جاؤ گی.....؟“

”کہیں بھی۔ دنیا بہت بڑی ہے۔“

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو.....!“ انہوں نے سخت لہجے میں ٹوکا تو وہ اپنی جگہ پہلو

بدل کر بولی۔

”پھر کب آرہے ہیں آپ.....؟“

”تم..... تم کیا چیز ہونو میہ! ہر ایک سے اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کروا لیتی ہو.....“

ان کی ہتھیار ڈالنے کے بعد والی بے بسی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر مطمئن ہو کر

مسکرائی تھی کہ وہ کہنے لگے۔

”سنو.....! سب کا یہ خیال غلط ہے کہ میں تمہاری وجہ سے نہیں آنا چاہتا۔ اصل بات یہ

ہے کہ میں تہیہ کر چکا تھا کہ جب بھی آیا صرف اور صرف تمہارے لئے آؤں گا اور اب تو تم خود بلا

رہی ہو.....!“

”کیا مطلب ہے آپ کا.....؟“ وہ اچھل پڑی۔

”جو بھی سمجھ لو.....“ انہوں نے کہا کہ فون بند کر دیا تو بے حد جھنجھلا کر وہ ہیلو کرتی رہ گئی۔

پھر شام تک غالباً بڑی اماں کے پاس غزنوی کا فون آچکا تھا۔ وہ آرہے تھے جیسی بڑی اماں بات بے بات ہنس رہی تھیں۔ وہ اس وقت رات کا کھانا بنا رہی تھی، کچن کی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ برآمدے میں بیٹھی تینوں خواتین بڑی مسرور نظر آ رہی تھیں۔ پھر اس نے سنا بڑی اماں کہہ رہی تھیں۔

”ٹھیک کہہ رہی تھی نومیہ! چار دن بچے کو سنبھال نہیں سکے گا اور بھاگا چلا آئے گا۔“

”یہی ٹھیک ہے جو وہ سمجھ رہی ہیں.....“ اس نے سوچا، پھر سر جھٹک کر آٹا گوندھنے میں مصروف ہو گئی۔

☆☆☆

غزنوی کو آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ اور اس سے بس ایک بار سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ کھڑے کھڑے حال احوال پوچھا۔ اس کے بعد وہ تو قصداً اوپر نہیں گئی تھی جب کہ ان کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ جانے کیا سوچ کر آئے تھے۔ حراسے اسے معلوم ہوا تھا کہ فی الحال ایک ہفتے کی چھٹی پر آئے ہیں۔ اس سے زیادہ حرا خود بھی نہیں جانتی تھی کہ آیا اس دوران وہ اپنی ٹرانسفر یہیں کروالیں گے یا واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ بہر حال ابتدائی چند دن بہت پریشان رہی کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ صرف اور صرف اس کے لیے آئیں گے اور یہ کہ اب تو وہ خود بلا رہی ہے۔ پتہ نہیں اس کے بلانے کا انہوں نے کیا مطلب لیا تھا۔

اسے تو زیادہ بڑی اماں کا خیال تھا جو ان کے لیے اتنی فکر مند تھیں۔ اور اب بڑی اماں تو فکر سے آزاد ہو گئیں لیکن وہ پریشان ہو گئی کہ اگر پھر غزنوی نے کوئی شوشہ چھوڑ دیا تو بڑے ابا تو پہلے ہی تیار بیٹھے ہیں۔ پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ اب اس کا کوئی عذر نہیں سنیں گے۔ بہر حال پھر بھی جب اس نے دیکھا کہ پہلے دن کی سرسری ملاقات کے بعد غزنوی کی طرف سے مزید پیش رفت ہوئی نہ انہوں نے کچھ بتایا۔ تب اس نے سوچا کہ یونہی اسے تنگ کرنے کی خاطر انہوں نے کہا دیا ہو گا کہ وہ صرف اس کی خاطر آئیں گے۔ آخر وہ بھی تو انہیں پریشان کرتی رہی ہے اور اس سوچ کے

تھیں۔

”تم چلو گی میرے ساتھ؟“

پھر وہی بات اور وہ نہیں کہتے ہوئے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔ چند لمحے توقف سے وہ اسکی کلائی پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

”اس طرح خود کو تنہا مت کرو نومیہ! بتاؤ کیا بات ہے؟“

اور شاید وہ تھک گئی تھی۔ یونہی روتے ہوئے اس نے راز پر سے پردہ ہٹا دیا جو اسے مسلسل اتنی محبت کرنے والی ہستیوں کی نفی پر مجبور کر رہا تھا۔ آخر میں کہنے لگی۔

”میں سامعہ کے بنا نہیں رہ سکتی غزنوی! عارف اسے مجھ سے چھین لے گا۔ اگر میں نے شادی کی تو وہ.....“

”بے وقوف ہو تم! یہ بات چھپا کر تم نے خود اپنے ساتھ ظلم کیا ہے۔ اور شاید تمہیں ہم پر بھروسہ نہیں تھا۔“ انہوں نے تاسف سے کہا تو وہ اپنی جگہ چوری بن گئی۔

”یہ بات نہیں ہے.....“

”یہی بات ہے.....“ ان کا غصہ بجا تھا۔ اسے کرسی سمیت پیچھے دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر ادھر سے ادھر ٹپکنے لگے۔ غالباً اس کی باتوں کو سوچ رہے تھے۔ وہ کن اکھیوں سے دیکھتی رہی۔ ایک طویل مدت بعد وہ پھر ان سے خائف ہو رہی تھی۔ براہ راست دیکھنے کی ہمت تھی نہ مخاطب کرنے کی۔ تب وہ اچانک رُک کر بولے۔

”تمہارے لکھ کر دینے سے سامعہ صرف عارف کی نہیں ہو سکتی۔ اول تو وہ ایسا کوئی دعویٰ نہیں کرے گا۔ اور اگر اس سے ایسی کوئی حماقت سرزد ہوئی تو تم سے جبراً لکھوانے کے جرم میں وہ اپنے جال میں خود پھنس جائے گا۔ سمجھیں تم.....!“ اس نے ذرا سی پلکیں جھپکیں، پھر سر جھکا لیا تو وہ ایک لمحہ توقف سے بولے۔

”اور تم بھی سزا سے نہیں بچ سکتیں کیونکہ اس کے جرم پر پردہ ڈال کر تم بھی برابر کی

انہیں ہرگز نہیں تھی۔ کچھ دیر تک اس پر نظریں جمائے بیٹھ رہے، پھر کہنے لگے۔

”کبھی بلاتی ہو، کبھی جانے کو کہتی ہو۔ آخر تم چاہتی کیا ہو.....؟“ وہ خاموش رہی تو دھیرج سے بولے۔

”میں تمہارے کہنے پر صرف تمہارے لیے آیا ہوں۔ اور جب تک یہ جان نہیں لیتا کہ تم مجھ سے اور ابو سے اپنی مرضی کے خلاف فیصلے کیوں کرواتی ہو، واپس نہیں جاؤں گا۔“

اس نے چونک کر دیکھا تو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔

”مجھے بتاؤ..... کس دباؤ میں ہو تم.....؟“

”مم میں کسی دباؤ میں نہیں ہوں۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”جھوٹ مت بولو!“

انہوں نے خاصے جارحانہ انداز میں آگے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی اور کھینچ کر کرسی پر گراتے ہوئے بولے۔ ”کیا سمجھتی ہو تم! میں تمہیں جانتا نہیں۔ ابو اور سب کا خیال ہے کہ تم پہلی شادی کی ناکامی سے خوفزدہ ہو لیکن میں نہیں مانتا اور مجھے تو تمہیں سچ بتانا پڑے گا۔ بتاؤ! اصل بات کیا ہے؟“

”آپ کو تو میں کبھی نہیں بتاؤں گی.....“ وہ ان کے جارحانہ انداز میں غصے سے بولی تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یعنی واقعی کوئی بات تھی۔ سمجھ کر پوچھنے لگے۔

”پھر کسے بتاؤ گی.....؟“

”کسی کو نہیں۔ بس آپ مجھے جانے دیں۔“ وہ اٹھنے لگی لیکن وہ کرسی کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر اس کا راستہ روک کر بولے۔

”تم کچھ کہنے آئی تھیں۔“

”کہہ تو دیا کہ آپ واپس لاہور چلے جائیں۔“

اسے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ ان کی نظریں اپنے چہرے پر بری طرح محسوس ہو رہی

محبت ایسا دریا ہے

اماں کو گئے ہوئے دو گھنٹے ہو گئے تھے اور اس کا ڈر کے مارے برا حال تھا۔ حالانکہ پہلے وہ ایسی ڈر پوک نہیں تھی اور اب شاید حالات نے اسے حد درجہ بزدل بنا دیا تھا۔ ہوا سے ذرا سا پتہ بھی ہلتا تو وہ خوفزدہ ہو کر دیکھنے لگتی۔ اماں نے بھی تو اتنی دیر کر دی تھی۔ پتہ نہیں کہاں چلی گئی تھیں۔ کچھ بتایا بھی نہیں تھا۔ اور باہر آوارہ لڑکے تو اسی انتظار میں رہتے تھے جہاں اماں گھر سے نکلیں وہ چار دیواری کے آس پاس منزل لانے لگتے۔ اونچی آواز میں فحش گانے اور ایسی ہی باتیں۔ اور وہ اندر بیٹھی سچ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی تھی۔ اب اُس کی سمجھ میں آتا تھا کہ بیمار اور لاغر سے ابا میاں جو چار پائی سے اٹھ بھی نہیں سکتے تھے اماں اُن کی دراز کی عمر کے لئے اتنی دُعا کیں کیوں مانگا کرتی تھیں۔

اتنے کمزور ہو کر بھی وہ کتنا بڑا سہارا تھے کہ کوئی خوف کوئی ڈر نہیں تھا۔ اور اُن کے رخصت ہوتے ہی گھر کی دیواریں اتنی کمزور ہو گئی تھیں کہ ہر دم اُن کے گرنے کا دھڑکا لگا رہتا۔ سر پر چھت نہ ہو تو خالی دیواریں کہاں تک پناہ دے سکتی ہیں۔ نہ پتی دھوپ کا رخ موڑا جاسکتا ہے نہ

شریک ہو۔ اس نے واقعی گھبرا کر پلکیں اٹھائیں لیکن ان کے ہونٹوں میں دبی مسراہٹ دیکھ کر فوراً کھڑی ہو گئی اور جانے لگی تو وہ پکار کر بولے۔

”سُنو! اپنی سزا تو سنبھال جاؤ۔“

”جی نہیں! اپنے لیے سزا میں خود تجویز کروں گی۔“ وہ رُک کر انہیں دیکھتی ہوئی بولی۔

”مجرموں کو ایسی رعایت دی تو نہیں جاتی۔ خیر! تم بتاؤ، کیا تجویز کرو گی؟“

انہوں نے قدرے تجسس سے پوچھا تو وہ اُلٹے پیروں چلتی ہوئی دروازے کے پاس

رُک کر بولی۔

”آپ کے بچے کو ماں کی ضرورت ہے اور میرے علاوہ اس کی کوئی ماں نہیں ہو

سکتی.....“

اس کا ارادہ اپنی بات کہہ کر بھاگ جانے کا تھا لیکن جب دروازے کا ہینڈل گھمایا تو وہ

کھلا ہی نہیں۔ لاک نہیں تھا اور شاید بوکھلاہٹ میں وہ الٹا گھمار ہی تھی۔ تب آگے آ کر انہوں نے

اس کا ہاتھ پکڑ کر ہینڈل گھمایا اور دروازہ کھولنے سے پہلے بولے۔

”تمہاری تجویز کردہ سزا میں کچھ اضافہ میری طرف سے کہ بچے کے ساتھ تھوڑی

گنجائش اس کے باپ کی بھی رکھنا کہ اسے بھی تمہاری ضرورت ہے۔ رکھو گی ناں.....؟“

پتہ نہیں یہ محبت کہاں چھپا رکھی تھی انہوں نے جواب اچانک ان کے لہجے میں سمٹ آئی

تھی۔ وہ انہیں دیکھنے کی کوشش میں بس ذرا سی پلکیں اٹھا سکی۔ پھر سر جھکا لیا تو اس کی گھبراہٹ سے

محفوظ ہوتے ہوئے انہوں نے دل کے ساتھ کمرے کا دروازہ بھی کھول دیا۔

☆☆☆

ستے مینہ کا۔

انہاں نے ساری زندگی حالات کی چکی میں پستے گزاری تھی۔ لیکن اس نے کبھی انہیں شاک کی نہیں دیکھا نہ حالات سے نہ مجازی خدا سے اور نہ خدا سے۔ پیٹ بھر روئی نہ ملتی تب بھی شکر کیا کرتی تھیں۔ اُنہی کی زبانی اسے معلوم ہوا تھا کہ ابامیاں ریلوے میں ملازم تھے اور یہ کوارٹر انہیں گورنمنٹ کی طرف سے ملا تھا اور یہ پتہ نہیں کب کی بات تھی ورنہ اُس نے تو جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ ابامیاں کے ہاتھ میں ایک دوا کی شیشی دیکھی تھی جسے لئے وہ سرکاری اسپتال کے چکر لگایا کرتے۔ بیماری نے انہیں وقت سے پہلے ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ اور انہاں سارا دن مشین پر جھکے جھکے دوہری ہو گئی تھیں۔ بہر حال کچھ بھی تھا انہاں اتنی پریشان کبھی نہیں ہوئی تھیں جتنی اب نظر آنے لگی تھیں۔ اور یہ ساری پریشانی اس کی وجہ سے تھی۔ جس پر جوانی نے اپنی تمام حشر سامانیوں سمیت در کھولے تھے اور انہاں جو بچ بچ بہت بہادر عورت تھیں اس مقام پر خود کو انتہائی بے بس محسوس کرنے لگیں۔

ابامیاں کے انتقال کو ابھی تین چار مہینے ہی ہوئے تھے اور اس عرصے میں اہل محلہ نے اس طرح آنکھیں پھیریں کہ انہاں خوفزدہ ہو گئیں۔ حالانکہ ابامیاں سدا کے مریض کبھی کسی سے اتنا واسطہ تعلق نہیں رکھا۔ وہی سب سے ملتی تھیں پھر بھی سارے لحاظ مٹ گئے۔ دنیا جہان کے نکلے آوارہ لڑکوں کو موقع مل گیا۔ دھڑلے سے اس گھر کے عین سامنے بیٹھک بنائی انہاں نے ایک ایک گھر جا کر اُن کی ماؤں کے سامنے ہاتھ جوڑے لیکن سب کا ایک ہی جواب تھا۔ جوان لڑکے ہیں ہم انہیں باندھ کر تو نہیں بیٹھا سکتے اور نہ سارا وقت ان کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ تم ہی اپنی لڑکی کو سنبھال کر رکھو۔

اور وہ کیسے سنبھال کر رکھتیں، کبھی بلا ضرورت کیا ضرورت بھی اُسے باہر نہیں نکلنے دیا تھا اور یہ حقیقت ہے کسی نے اُس کی جھلک بھی نہیں دیکھی ہوگی۔ البتہ اپنی ماں بہنوں کی زبانی چرچے سنے ہوں گے کہ وہ ایسی حسین ہے، بہر حال اب انہاں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُسے لے کر کہاں

جائیں۔ سارا دن ایسی ایسی آوازیں آتیں کہ ماں بیٹی ایک دوسرے سے نظریں چرائے پھرتیں بچ بچ اُس کا مر جانے کو دل چاہتا تھا۔

کسی کسی وقت تو وہ بہت سنجیدگی سے سوچنے بیٹھ جاتی کہ اُسے واقعی مر جانا چاہیے۔ اُس کی وجہ سے انہاں بھی زیادہ پریشان ہیں وہ نہیں ہوگی تو انہاں آرام سے رہ لیں گی۔ لیکن پھر انہاں ہی کا خیال کہ بیچاری کتنی اکیلی ہو جائیں گی ابھی بھی پتہ نہیں کہاں چلی گئی تھیں۔ اتنی دیر تو وہ کہیں نہیں رکتی تھیں۔ سلائی کے کپڑے دینے اور لینے جائیں تو کھڑے کھڑے ہی اونتی تھیں۔

اور اب تو دو گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے وہ ڈر کے مارے کمرے سے باہر ہی نہیں نکل رہی تھی۔ حالانکہ دل چاہ رہا تھا انہاں کے آنے سے پہلے روٹی پکا کر رکھ دے۔ لیکن باہر تیز آواز میں ٹیپ بچ رہا تھا ساتھ ہی بے ہنگم قہقہے تھے جس کی وجہ سے وہ کچن تک جانے کی ہمت بھی نہیں کر سکی۔ اپنا ہی گھر کتنا بے اماں ہو گیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، کتنی دیر گزر گئی۔

اُس کے آنسو آپ ہی آپ تھم گئے، تب اُسے انہاں کی طرف سے تشویش ہونے لگی۔ سو طرح کے اندیشے تھے جنہوں نے اُسے ہولا کر رکھ دیا۔ اور وہ شدت سے انہاں کی خیریت سے واپسی کی دُعا میں مانگنے لگی، تبھی دروازے پر مخصوص دستک سنائی دی تو وہ بھاگ کر کمرے سے نکل کر آئی، لیکن پھر رُک کر پہلے انہاں کے ہونے کا یقین کیا پھر دروازے کی گنڈی کھول کر ایک طرف ہو گئی اور جیسے ہی انہاں نے اندر آ کر دروازہ بند کیا وہ اُن سے پٹ گئی۔

”کہاں چلی گئی تھیں انہاں؟ اتنی دیر لگا دی۔“

آنسو پھر چھلک گئے اور انہاں کو اُس کی پریشانی کا اندازہ تھا پھر بھی اسے خود سے انگ کرتے ہوئے بولیں۔

”رونے کی کیا بات ہے۔ کام سے گئی تھی دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ چلو اندر ذرا میرے لیے پانی لیتی آؤ۔“

اُس نے رُک کر انہاں کو دیکھا بہت مضطرب اندر جا رہی تھیں۔ اس نے دوپٹے کے پلو

امان کہتے ہوئے خود بھی اٹھ گئیں اور اُس کے ساتھ چیزیں اٹھا اٹھا کر اسٹور میں رکھنے لگیں۔ کوئی اتنا زیادہ سامان نہیں تھا۔ پھر بھی چھوٹی موٹی چیزیں سینے میں کافی وقت لگا اور اس دوران وہ کافی اُلجھتی رہی۔

امان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتیں اس لئے وہ خود ہی قیاس کرتی رہی لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ سمجھتی بھی کیسے کبھی کسی عزیز رشتے دار کو گھر میں آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ پہلے امان سے بہت پوچھا کرتی تھی اور ایک بار انہوں نے بتایا تھا کہ جب وہ شادی ہو کر یہاں آئی تھیں تو گھر میں ابا میاں کے علاوہ اس کی دادی تھیں جو سال بعد ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اور ابا میاں کے ایک بڑے بھائی کہیں باہر رہتے تھے۔ بڑے آدمی تھے غریب بھائی سے مانا پسند نہیں کرتے تھے دادی کے انتقال پر کچھ دنوں کے لئے آئے تھے تب ہی امان نے انہیں دیکھا تھا۔ اس کے بعد جو گئے تو دوبارہ کبھی شکل نہیں دکھائی تھی اور ایسے تایا جو اُس کے ابا میاں سے نہیں ملتے تھے۔ اُن سے ملنے یا انہیں دیکھنے کی اُسے کوئی آرزو نہیں تھی۔

پھر بار بار اُس نے اپنے ننھیال کے بارے میں پوچھا تھا تو جانے کیوں امان خاموشی اختیار کر لیتیں یا پھر فوراً ہی اُس کا دھیان ادھر ادھر کر دیتی تھیں۔ اس وقت سوچتے ہوئے اچانک اُسے خیال آیا کہ شاید امان کو اپنا کوئی عزیز رشتہ دار مل گیا ہے اور وہ فوراً پوچھے بغیر رہ نہیں سکی۔

”امان! کیا ہم نانا کی طرف جا رہے ہیں؟“

”کون نانا؟“ امان نے بُری طرح چونک کر اُسے دیکھا تو وہ گڑبڑ اُٹتی۔

”وہ میرا مطلب ہے آخر آپ بتاتی کیوں نہیں؟“ وہ اُلجھ کر رونے لگی تو امان نے اس

کا ہاتھ پکڑ کر پاس بیٹھا لیا پھر اس کے آنسو پونچھ کر کہنے لگیں۔

”کیا بتاؤں تمہارے ابا میاں کے ایک جاننے والے ہیں اُنہی کے پاس گئی تھی اپنی

آپ بیتی سنائی اور وہ کوئی ایسے خدا ترس آدمی تو نہیں ہیں بس اللہ نے ہماری طرف سے کچھ رحم اُن

”اور اسے کہاں لے جا رہی ہو؟“ مختلف آوازیں تھیں جو اگر رکشے کا شور نہ ہوتا تو جانے کہاں تک تعاقب کرتی چلی آتیں۔

☆☆☆

”آگئیں ہوا؟“ اتنے کشادہ اور جدید فرنیچر سے آراستہ کمرے میں وہ انماں کے ساتھ کچھ سہمی ہوئی سی کھڑی تھی کہ اس آواز پر چونک کر دیکھنے لگی۔ اُس کا چہرہ ابھی بھی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ جھری میں سے دیکھ رہی تھی۔ قیمتی ساڑھی میں ملبوس بہت ماڈرن قسم کی خاتون تھیں وہ مرغوب ہوئی لیکن انماں کو اُن کا بوا کہنا بالکل اچھا نہیں لگا۔ یوں جیسے نوکر کو مخاطب کیا جاتا ہے اور انماں کے جواب نے اُسے مزید دکھ سے ہمکنار کیا۔

”جی بیگم!“

”یہ تمہاری لڑکی ہے؟“ اُس کے چادر میں لپٹے وجود پر نظر ڈال کر نخوت سے پوچھا۔

”جی بیگم!“

”اسے کام و ام بھی آتا ہے یا؟“

”غریب کی لڑکی کو کام ہی تو آتا ہے۔ پر بیگم آپ کو اسے بلانے کی ضرورت نہیں پڑے گی مجھ میں اتنا دم خم ہے کہ۔“

”اچھا اچھا جاؤ چوکیدار سے کہو تمہیں کو اوارڈ دکھا دے۔“

انماں کمال ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھیں جبکہ وہ کو اوارڈ میں آتے ہی رونے لگی۔ اس لئے نہیں کہ تقدیر لکھنے والے نے یہ دن دکھایا تھا بلکہ اس لئے کہ اُس کے بندوں نے زندگی کے راستے تنگ کر دیے تھے۔ کہ اپنا گھر چھوڑ کر انماں دوسرے کی نوکری کرنے پر مجبور ہوئیں۔

”ہائیں اتم رونے کیوں لگیں؟“ انماں سب سمجھ رہی تھیں پھر بھی تعجب کا مظاہرہ کیا۔

”انماں؟ اب آپ دوسروں کے برتن مانگیں گی۔“ وہ اسی طرح روتے ہوئے بولی۔

”دوسروں کے پیڑے بھی تو سیتی تھی۔ خیر یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے تم جی جیو نا

کے دل میں ڈال دیا۔ اپنے گھر میں ایک کمرہ دینے پر آمادہ ہو گئے۔ بس وہیں چل کر رہیں گے۔“

”کیا وہ اکیلے رہتے ہیں؟“ اُس کی تسلی نہیں ہوئی بلکہ اور سہم کر پوچھا۔

”ارے نہیں بال بچوں والے ہیں۔ اتنا بڑا گھر ہے اُن کا۔ ایک کونے میں ہم پڑے رہیں گے انہیں پتہ بھی نہیں چلے گا۔ اور دیکھو تم ذرا احتیاط سے رہنا۔ اُن کی بیگم کا مزاج خیر ہمیں کسی کے مزاج سے کیا لینا دینا۔ گالیاں بھی دیں گی تو سُن لیں گے۔“

”کیوں انماں گالیاں کیوں سنیں گے؟“

”بیٹا! وہ گالیاں بہتر ہیں ان لوغر لپاڑوں کی باتوں سے۔ خیر تم دل چھو نا نہیں کرو گالیاں بھی کوئی خواہ مخواہ نہیں دیتا۔ اور ہم اُنہیں موقع ہی نہیں دیں گے چلو اب تم دروازے بند کرو میں رکشے لے کر آتی ہوں۔ جن بلی کو چاہی بھی دیتی آؤں گی!“

انماں اُٹھ کر برقعہ اوڑھنے لگیں۔ اُس نے خاموشی سے اُنہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر آ کر کمرے کے دروازے بند کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد جب باہر رکشہ رکنے کی آواز آئی تو وہ بکس کھینچ کر دروازے کے پاس لے آئی۔ اور بڑی سی چادر کو اچھی طرح اپنے گرد لپیٹ کر چہرہ بھی چھپانے لگی۔ معاً انماں پر نظر پڑی بڑی حسرت سے بند دروازوں کو تنک رہی تھیں پھر آہ بھر کر بولیں۔

”اللہ کی مرضی جس حال میں رکھے چل بیٹا۔“

اُس نے پہلے بکس باہر دھکیلا جسے انماں کے کہنے پر رکشہ والے نے اُٹھا کر رکشے میں رکھا۔ پھر وہ انماں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ سامنے بیٹھے لڑکوں نے حیرت سے دیکھا پھر بھاگے چلے آئے۔

”بڑی بلی کہاں جا رہی ہو؟“ انماں نے کوئی جواب نہیں دیا رکشہ والے سے کہنے لگیں۔

”چلو بیٹا جلدی چلو۔“

”کیا ٹرین چھوٹ رہی ہے؟“

لگیں۔ ”بلکہ ایسا کرو تم آ جاؤ کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی ام کلثوم۔“ بیگم نے نام سن کر سر تاپا اُسے دیکھا، کہیں سے بھی ملازمہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ شکل صورت کے علاوہ جلیہ بھی ٹھیک ٹھاک تھا سر جھٹک کر بولیں۔

”آؤ میرے ساتھ۔ اور بوا بارہ بجے تک کھانا تیار کر لینا۔ صاحب کے مہمان باہر سے آ رہے ہیں۔ کھانا اچھا ہوا اور مرچیں ذرا کم ڈالنا۔“

”جی بیگم!“ انماں نے انہیں جواب دے کر اُسے آنکھوں سے جانے کا اشارہ کیا تو وہ بیگم کے پیچھے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ انہوں نے کھڑے کھڑے اُسے کچھ ہدایات دیں اور غلات میں دوسرے دروازے سے نکل گئیں تو وہ چمکتی ہوئی چیزوں کو مزید چمکانے لگی۔ حیران بھی ہو رہی تھی کہ کہیں ہلکی سی گرد کا شائبہ تک نہیں تھا تب اسے اپنا گھریا دیا جو صبح شام صفائی کے باوجود بھی اس طرح نہیں چمکتا تھا۔

پھر بھی اپنے گھر کا خیال آتے ہی اس کی پلکیں نم ہو گئیں۔ دھندلائی آنکھوں سے ٹیبل کی چمکیلی سطح پر اسے اپنا ہیولا دھندلا نظر آیا تو وہ بجائے آنکھیں صاف کرنے کے کارپٹ پر گھٹنے ٹیک کر بیٹھی اور دوپٹے کے پلو سے ٹیبل صاف کرنے لگی۔ کچھ دیر بعد جھک کر اپنا آپ دیکھنا چاہا تو پلکوں پر انکے قطرے چھٹک پڑے۔ تب گھبرا کر پہلے آنکھیں صاف کیں پھر جلدی جلدی ٹیبل صاف کر رہی تھی کہ دروازے پر آہٹ سن کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا خیال تھا بیگم ہوں گی، لیکن جیسے ہی پلٹ کر دیکھا۔ ٹھٹک گئی۔ تھری پیس براؤن سوٹ میں ملبوس ادھیڑ عمر کے غالباً صاحب تھے جو ایک سرسری نظر اُس پر ڈال کر ادھر ادھر دیکھنے لگے اور کسی اور کو موجود نہ پا کر دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوئے تو شش و پنج میں تھے۔ غالباً سمجھ نہیں پائے کہ وہ کون ہے اور اُسے کیسے مخاطب کریں۔ پھر کچھ اس طرح بول پائے۔

”وہ بیٹا۔ کیا نام ہے تمہارا؟“

”ام کلثوم!“

”ماشاء اللہ بہت.....“ اسی قدر کہا تھا کہ بیگم کی آمد پر اُن سے پوچھنے لگے۔ ”بھئی یہ بچی کون ہے؟“

”بوا کی لڑکی ہے۔ ہاں کلثوم تم نے صفائی کر لی ہے تو جاؤ اپنی انماں کا ہاتھ بناؤ۔“ بیگم نے ساتھ ہی اُسے بھی جانے کو کہہ دیا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ڈرائنگ روم سے نکل آئی۔ عجیب سی الجھن تھی۔ انماں نے بتایا تھا کہ یہ ابامیاں کے جاننے والے ہیں اور اسے بھی یہی لگ رہا تھا جیسے پہلے کہیں دیکھا ہے لیکن فوراً یاد نہیں آ رہا تھا جہی انماں کے پاس آتے ہی پوچھنے لگی۔

”انماں! یہ صاحب کیا ابامیاں کے دوست تھے؟“ پیاز کاٹتے ہوئے انماں نے ایک لمحہ رک کر اُسے دیکھا پھر دوبارہ چھری چلاتے ہوئے بولیں۔

”پتہ نہیں۔“

”آپ ہی نے تو بتایا تھا کہ ابامیاں کے جاننے والے ہیں۔“

”ہاں پھر.....؟“ انماں نے قدرے تیکھی نظروں سے دیکھا تو وہ خاموش ہو گئی۔ لیکن اندر ہی اندر الجھ رہی تھی کہ آخر اُس نے ایسی کیا بات کہہ دی ہے جو انماں بگڑنے لگیں۔

☆☆☆

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اُسے تنہا اور فارغ بیٹھنے سے کونھی میں کوئی نہ کوئی کام کرتے رہنا زیادہ بہتر لگتا تھا کیونکہ اس طرح کم از کم وقت گزرنے کا پتہ تو چلتا تھا۔ ابتدائی دنوں میں کچھ جھجک سی تھی لیکن اب ہر کام بڑے آرام سے کر لیتی بیگم کو کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔ فرح رُشنا اور روبی کے جانے کے بعد اُن کے کمرے ٹھیک ٹھاک کر دیتی۔

فرح اور روبی کے کمرے تو ٹھیک ہی ہوتے تھے البتہ رُشنا بہت چیزیں پھیلاتی تھی جنہیں سینے میں اُسے کافی وقت لگتا تھا۔ آخر میں بیگم کے کمرے میں جاتی تو ان کے موڈ پر منحصر ہوتا تھا۔ کبھی کبھار بیٹکی چادر وغیرہ چھینچ کر دو اور کبھی دروازے ہی سے اونادیتیں۔

”نہیں! اناں! وہاں میرا دل نہیں لگتا۔“

”کیا!“ اناں چونک کر اُسے دیکھنے لگیں۔ کچھ اکتائی ہوئی بیزار سی بیٹھی تھی۔ انہیں تشویش ہونے لگی اور اس سے پہلے کہ ٹوکیتں وہ ان کے پاس سے اٹھ کر چلی آئی۔ ہمیشہ کی طرح سردی اچانک ہی شروع ہوئی تھی۔ اتنے دنوں سے موسم خوشگوار تھا اور اناں کہہ بھی رہی تھیں کہ گھر سے لحاف لے آئیں گی لیکن اُن کا جانا ہی نہیں ہوا تھا۔ اور اس رات غالباً کوسٹہ میں بر فباری کے باعث سرد ہوا میں چلنے لگی تھیں۔ وہ رات بھر ایک چادر میں ٹھنھرتی رہی اور اناں تو صبح اٹھ ہی نہیں سکیں۔ سردی کے ساتھ انہیں تیز بخار نے آلیا تھا۔ اُس نے جلدی سے اپنے کچن میں آکر چائے بنائی۔ پھر انہیں اٹھاتے ہوئے بولی۔

”آپ نے تو کمال کر دیا اناں! پتہ بھی تھا کہ سردی یکدم شروع ہو جاتی ہے پھر بھی لحاف نہیں لائیں۔“

”آج لے آؤں گی۔“ اناں اپنے آپ میں سکڑتے ہوئے بولیں۔

”آج کیسے لائیں گی! اتنا تو بخار ہو رہا ہے آپ کو۔“

”ٹھیک ہو جاؤں گی۔ ذرا دھوپ نکل آئے تو سردی بھی اتر جائے گی۔ تم جا کر اُن کا

ناشتہ بنا دو۔“

”میں.....!“ وہ بے اختیار کہہ گئی۔ کیونکہ اناں ہی کے کہنے پر وہ ناشتہ وغیرہ کے بعد ہی اس طرف جاتی تھی۔ پھر کچھ جربز ہو کر بولی۔ ”میں نہیں جا رہی اناں بیگم خود ہی بنالیں گی۔“

”وہ نہیں بنائیں گی بلکہ تمہیں بلانے آجائیں گی اور بگڑیں گی الگ۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے ورنہ میں خود۔“

”بس آپ لیٹ جائیں آرام سے۔“ وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے بول

پڑی۔ پھر اپنی چار پائی سے گد ا کھینچ کر انہیں اوڑھایا اور خود چادر اوڑھ کر چلی آئی۔

اُس نے سوچا سب کے ڈانگ روم میں آنے سے پہلے ہی ناشتہ بنا کر ٹیبل پر رکھ دے

اُس وقت بھی وہ اُن کے کمرے میں داخل ہوئی لیکن صاحب کو موجود دیکھ کر اس خاموشی سے واپس پلٹنے لگی کہ انہوں نے پکار لیا۔

”آؤ آؤ..... کس کام سے آئی تھیں؟“

”صفائی کرنی تھی۔“

”صفائی.....!“ انہوں نے تعجب سے کہا۔ ”تم سے کس نے کہا صفائی کرنے کو میرا مطلب ہے وہ صفائی والی ماسی کہاں گئی؟“

”پتہ نہیں صاحب! میں نے تو اُسے نہیں دیکھا۔“ اُس نے سادگی سے کہا تو جانے کیوں وہ نظریں پُجرا گئے۔

”اچھا تم جاؤ۔ اور سنو! آئندہ تم یہ صفائی وغیرہ کے کام نہیں کرنا۔“

”اور کیا کروں؟“ وہ بلا ارادہ پوچھ گئی۔

”کچھ نہیں۔ تم کچھ مت کیا کرو۔“ وہ الجھ کر بولے تو وہ بھی الجھتی ہوئی اُن کے کمرے سے نکل آئی اور اناں کے پاس آکر بولی۔

”صاحب نے مجھے صفائی کرنے سے منع کر دیا ہے۔“

”اچھا!“ اناں ہنسیں۔ پھر اُس کے تعجب سے دیکھنے پر کہنے لگیں۔ ”اُن کے منع کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ خیر جس دن وہ گھر پر ہوا کریں تم کوئی کام نہیں کیا کرو۔“

”کیوں اناں؟“

”انہیں نہیں جو اچھا لگتا۔ اور آج چھٹی کا دن تو نہیں ہے پھر وہ گھر پر کیسے ہیں۔ طبیعت ٹھیک ہے اُن کی؟“ اناں نے اچانک خیال آنے پر پوچھا تو وہ ذرا سے کندھے جھٹک کر

بولی۔

”مجھے کیا پتہ؟“

”اچھا تم کوارٹر میں جاؤ۔ میں کر لوں گی سب!“

نیل پر بیٹھ گئیں تو وہ جو دروازے میں کھڑا تھا خاموشی سے چلا گیا۔ وہ کپ میں چائے بنا کر پلٹی اور اُسے موجود نہ پا کر کپ بیگم کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے بعد ناشتہ بنانے میں لگ گئی۔ پھر جتنا وہ جلدی کرنا چاہ رہی تھی اتنی ہی دیر ہو رہی تھی اور سب کی موجودگی میں بار بار اُسے کچھ نہ کچھ لے کر ڈائننگ روم میں جانا پڑا۔ گوکہ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی پھر بھی وہ پریشان ہو گئی۔ کیونکہ بار بار خیال آ رہا تھا میں کسی کی نوکرتوں نہیں ہوں جو ایک ایک چیز اٹھا کر دے رہی ہوں۔

”نوکر ہی تو ہوں۔“ جب ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھی تو آزدگی میں گھر کر سوچا۔

”میں سودا لینے جا رہا ہوں بیٹا! تمہاری امتاں کی دوالانی ہے؟“

رحمت بابا ہاتھ میں تھیلا لیے پوچھ رہے تھے۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔

”ہاں بابا! امتاں کی دوالانی ہے۔ ٹھہریں میں پیسے لے کر آتی ہوں۔“

وہ بھاگ کر امتاں سے پیسے لے آئی اور ادھر ادھر سے تلاش کر کے ایک شیشی بھی انہیں تھما دی۔ پھر کچن کی صفائی میں لگ گئی۔ یہاں سے فارغ ہو کر کمروں کا رخ کیا۔ جب رشنا کے کمرے میں آئی تو اسے کمرے میں پڑے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”کیا آپ کو بھی بخار ہو گیا ہے؟“

”اور کسے ہے؟“ رشنا نے میگزین پر سے نظریں ہٹا کر اُسے دیکھا۔

”امتاں کو رات اتنی سردی میں خالی چادر میں پڑی رہیں بخار تو ہونا ہی تھا۔“

”کیوں کیا تمہارے پاس لحاف وغیرہ نہیں ہیں؟“

”ہیں۔ آج امتاں لے آئیں گی۔“

”کہاں سے.....؟“ رشنا یونہی بات کرنے کی غرض سے پوچھ رہی تھی اور معاً اُسے خیال آیا۔ امتاں نے اپنے بارے میں کچھ بھی بتانے سے منع کر دیا تھا۔ فوراً بات بتاتے ہوئے بولی۔

”اس سے پہلے جہاں ہم رہتے تھے کافی چیزیں وہیں رہ گئیں۔ امتاں نے کہا تھا آہستہ

تاکہ بار بار سب کے سامنے جاننا نہ پڑے۔ اسی لئے جلدی جلدی ڈبل روٹی کا پیکٹ کھول رہی تھی کہ عقب سے آواز آئی۔

”بوا! آج ابھی تک چائے۔“ اور بلا ارادہ پلٹی اور بوا کی جگہ اُسے دیکھ کر وہ اپنی جگہ ٹھٹھک گیا۔ پھر جھل سا ہو کر بولا۔

”آئی ایم سوری میں سمجھا بوا۔ بوا کہاں ہیں؟“

”بیمار ہیں۔“ وہ کیتلی اٹھا کر سنک کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”اور آپ میرا مطلب ہے آپ!“ صاحب کی طرح وہ بھی الجھ گیا کہ اُسے کیا سمجھے۔

اُس نے پہلے کیتلی چولہے پر رکھ کر چولہا جلایا۔ پھر بڑے آرام سے بولی۔

”میرا نام ام کلثوم ہے اور میں بوا کی بیٹی ہوں۔“

”آپ.....!“ اُسے یقین نہیں آیا۔ پھر فوراً پوچھنے لگا۔ ”آپ کہاں سے آئی ہیں میرا

مطلب ہے کہاں رہتی ہیں؟“

”یہیں کوارٹر میں۔“

”لیکن میں نے تو اس سے پہلے آپ کو نہیں دیکھا۔“

”میں نے بھی اس سے پہلے آپ کو نہیں دیکھا صاحب! حالانکہ آپ یہیں رہتے

ہیں۔“ اُس کی بات پر وہ بے ساختہ ہنسا تبھی اُس کے عقب سے بیگم کی آواز آئی۔

”کیا ہوا سیف؟“ وہ گڑبڑا کر پیچھے ہٹا۔

”وہ منہ..... چائے۔“

”ہاں یہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی!“ بیگم کہتی ہوئی کچن کے اندر آئیں اور اُسے

دیکھ کر پوچھنے لگیں۔ ”آج تم ناشتہ بنا رہی ہو۔“

”جی بیگم! امتاں کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”اچھا تو جلدی کرو صاحب لوگوں کو آفس جانا ہے۔“ بیگم تنبیہ کرتے ہوئے وہیں

آہستہ لے آئیں گی۔ لحاف بھی وہیں ہیں۔“

”اچھا سنو! تم نے کچھ پڑھا بھی ہے؟“ رُشنا کمر کے پیچھے تکیہ سیدھا کر کے بیٹھتی ہوئے پوچھنے لگی۔ تو وہ نظریں پُجرا کر بولی۔

”بس پڑھ لیتی ہوں۔“

”کیا پڑھ لیتی ہو؟“

”یہی اخبار اور رسائل وغیرہ۔“

”اخبار اور رسائل! رُشنا نے دہراتے ہوئے بغور اُسے دیکھا۔ پھر براہِ راست

پوچھا۔ ”کہاں تک پڑھا ہے؟“

”بس رُشنا بی! زیادہ نہیں پڑھ سکی۔ حالانکہ اپا میاں چاہتے تھے میں بی اے ایم اے کروں لیکن۔“ وہ انجانے میں پھر بچ بولنے لگی۔ ”اپا میاں کی زندگی نے وفا نہیں کی ورنہ میں ضرور پڑھتی۔“

”پھر بھی کتنا پڑھا ہے؟“ رُشنا کا تجسس فطری تھا۔

”میرٹک کیا ہے۔“

”واہ.....!“ رُشنا نے بے اختیار سراہا۔ پھر کہنے لگی۔ ”ویسے مجھے پہلے ہی شبہ تھا کیونکہ

روزانہ میرے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے جس طرح سے تم میری کتابوں کو ترتیب سے رکھتی ہو۔ اُس سے میں سمجھ گئی تھی کہ تمہیں کتابوں کی سمجھ بوجھ ہے۔“

”لیکن رُشنا بی! آپ کسی کو بتائیے گا نہیں۔“ وہ کچھ پریشان ہو کر بولی۔

”کیوں؟ یہ کوئی معیوب بات تو نہیں ہے بلکہ میرے کالج میں ایڈمیشن لو۔

پرائیویٹ بھی کر سکتی ہو۔“ رُشنا نے خلوص سے مشورہ دیا لیکن وہ نفی میں سر ہلا کر تاتف سے بولی۔

”کیا کروں گی بی بی! پڑھ کر؟“

”بہت کچھ کر سکتی ہو پہلی بات پڑھی لکھی شہری کہلاؤ گی پھر اچھی جاب کر لینا اس کے

بعد تمہارے لیے رشتوں کی لائن لگ جائے گی کیونکہ شکل ویسے ہی اتنی پیاری ہے۔“ وہ کچھ نہیں بولی۔ چپ چاپ دیکھتی رہی تو رُشنا نے ہنس کر پوچھا۔

”کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“ وہ نفی میں سر ہلا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اُس کی ادھر ادھر بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ جس خواہش کو دبا کر وہ اطمینان سے ہو گئی تھی اُسے رُشنا نے ہوا دے کر ایک بار پھر اُسے مضطرب کر دیا تھا۔

رات میں کتنی دیر تک وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ رُشنا کی باتوں نے اُسے بے چین کر دیا تھا۔ بار بار سر جھٹک کر دھیان ادھر ادھر کرنے کی کوشش کرتی لیکن کچھ دیر بعد ذہن پھر ادھر ہی اُلجھ جاتا۔ بالآخر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اتناں کو دیکھا بے خبر سو رہی تھیں اور اُس سے اتنا صبر نہیں ہوا کہ صبح کا انتظار کر لیتی۔ اُسی وقت انہیں اٹھا دیا۔

”کیا ہو گیا، خیریت تو ہے۔“ اتناں پریشان ہو گئیں۔

”سب ٹھیک ہے اتناں! بس مجھے نیند نہیں آرہی۔“ وہ عاجزی سے بولی۔

”آؤ میرے پاس بیٹھو!“ اتناں نے کنارے کھسک کر اُس کے لئے جگہ بنائی تو وہ اُن کے ساتھ لپٹ گئی۔ بخار کے باعث اُن کا جسم ابھی بھی بہت گرم ہو رہا تھا۔ وہ تشویش سے بولی۔

”اتناں! آپ کو تو ابھی بھی اتنا بخار ہے دو الی تھی آپ نے؟“

”ہاں۔“

”صبح آپ رحمت بابا کے ساتھ چلی جائیے گا ڈاکٹر کے پاس۔ پتہ نہیں کیسی دوا دی ہے

اس نے۔“

”اچھا بس.....! اب تم چپ چاپ سو جاؤ۔“ اتناں خود نیند میں تھیں اس لئے اُس کا

باتیں کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی، لیکن جیسے ہی اتناں نیند میں جانے لگیں انہیں ہلا کر بولی۔

”اتناں! پہلے میری بات تو سن لیں۔“

”اتناں!“ وہ اس قدر کہہ سکی۔ ابھی ایسی ہی عمر میں تھی جہاں شادی کے نام پر ہونٹ تھرک کر رہ جاتے ہیں۔

☆☆☆

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ رشنا اب بھی جب موقع ملتا اُسے پڑھنے پر اکساتی، لیکن اُسے اتناں کی باتوں میں زیادہ صداقت نظر آئی تھی۔ شاید اس لئے کہ جن تلخ حقائق کی اتناں نے نشاندہی کی تھی اُن سے وہ گزر بھی چکی تھی اور آگے بھی اُسے یہی سب نظر آتا تھا۔ اس لئے رشنا کی باتیں بس سن لیتی تھی۔

اُنہی دنوں اچانک فرح کی شادی طے پا گئی تو بیگم نے اتناں کو کتنے بہت سارے کاموں میں الجھا دیا۔ غالباً ان دو تین مہینوں میں اُنہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ کسی مجبوری کے تحت ہی وہ گھر کی نوکری کرنے پر مجبور ہوئی ہیں ورنہ گھریلو معاملات میں سمجھ بوجھ، نشست و برخاست میں سلیقہ اور رک رکھاؤ اُنہیں کچھ اور ہی ظاہر کر رہا تھا۔ اس لیے بیگم ان پر کافی اعتماد بھی کرنے لگی تھیں۔ فرح کے جہیز کی ہر چیز میں ان سے مشورہ لیتیں اور اتناں بھی یوں مصروف تھیں جیسے اپنے گھر کی شادی ہو۔ جبکہ کچن کا سارا کام اُس کے سر پر آتا تھا۔ پھر کمروں کی جھاڑ پونچھ بھی کرنی ہوتی تھی۔ وقت بے وقت مہمانوں کی آمد پر چائے پانی کا انتظام الگ۔

وہ واقعی گھن چکر بنی ہوئی تھی۔ اس وقت ابھی دو پہر کے کھانے کے برتن دھو کر فارغ ہوئی تھی کہ بیگم نے سیف کا کمرہ صاف کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ جس سے وہ بوکھلا گئی کیونکہ سیف کا کمرہ اوپر تھا اور وہ کبھی اوپر نہیں گئی تھی نہ ہی کبھی اتناں نے اُسے کہا تھا۔ خود ہی دن میں کسی وقت جا کر اُس کا کمرہ ٹھیک کر آتی تھیں۔

اُس وقت اتناں پتہ نہیں کہاں تھیں اور بیگم نے براہ راست اُس سے کہہ دیا تو وہ انکار نہیں کر سکی، لیکن اوپر جاتے ہوئے ڈر بھی رہی تھا حالانکہ سیف اُس وقت گھر پر نہیں ہوتا تھا۔ پھر بھی اُس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی پہلے اُس نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ پھر

”اب کیا بات ہے؟“ اتناں کی جھنجھلاہٹ کے باوجود وہ اپنی بات کہے بغیر نہیں رہ سکی۔ اور پھر کسی تمہید کے بغیر بولی۔

”اتناں! میں پھر سے پڑھنا شروع کر دوں، بی اے ایم اے کر سکتی ہوں۔“ کوئی ایسی بات تو نہیں کی تھی اُس نے لیکن اتناں کی نیند اڑ گئی۔ پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور وہ اپنی دُھن میں بو لے گئی۔

”اچھا ہے ناں اتناں! پڑھ لوں گی تو کسی اچھی جگہ نوکری مل جائے گی۔ مجھے اس طرح دوسروں کے گھر میں نوکروں کی طرح رہنا اچھا نہیں لگتا۔ بتائیں ناں اتناں۔“ اور اتناں گہری سانس کھینچ کر بولیں۔

”نہیں بیٹا! کوئی فائدہ نہیں تم کتنا بھی پڑھ لو رہنا ہمیں یہیں ہے۔ اب تمہیں اچھا لگے یا نہ لگے یہاں کم از کم عزت تو محفوظ ہے۔ ورنہ مجھے اپنا گھر چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟“ پھر سمجھاتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”تم نے دیکھا نہیں اکیلی عورتوں کے ساتھ لوگ کیسا سلوک کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم نہ کسی کا کھاتے تھے نہ کسی سے مانگتے تھے۔ پھر بھی لوگوں کو نہ میری بیوگی کا خیال تھا نہ تمہاری یتیمی کا۔ اُلٹا ہم پر زندگی تنگ کر دی۔“

”سب لوگ تو ویسے نہیں ہوتے اتناں!“

”سب ایک سے ہوتے ہیں بیٹا! وہ ذرا جاہل اور کم پڑھے لکھے لوگ تھے اُنہیں اپنی عزتوں کا بھی پاس نہیں تھا جبکہ پڑھے لکھے لوگ خود پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ خیر تم کیوں فکر کرتی ہو، تمہیں کون سا زیادہ دن یہاں رہنا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بالکل نہیں سمجھی اور اتناں اُس کی پیشانی پر آئے بال ہٹاتے ہوئے

بولیں۔

”میں نے صاحب سے کہا ہے، کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر تمہاری شادی کر دیں۔ تم اپنے گھر کی ہو جاؤ گی تب مجھے کوئی فکر نہیں رہے گی۔“

منک رہتی راجہ تورے بنگلے پر
وہ اُس کے گلابی تراشیدہ ہونٹوں کو دیکھے گیا جن پر جانے یا انجانے میں ایک خواہش
چل رہی تھی۔ اور ایک پل میں اُس کی تصور کی دنیا آباد ہو گئی۔ یہاں وہاں ہر طرف وہ ہی وہ تھی۔
بہت بے اختیار ہو کر بس ایک قدم اُس کی طرف بڑھا سکا کہ حیشیتوں کی دیوار سامنے آ گئی۔ خواہ کتنی
حسین سہی تھی تو ایک ملازمہ۔ اس خیال کے ساتھ ہی ذرا سا کھانا تو وہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔
”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ لہجے کو سخت بنانے کی کوشش میں ناکام ہو کر وہ نظریں پُرا

گیا۔

”صفائی کرنے آئی تھی۔“

”کر لی.....؟“

”جی۔“

”تو جاؤ یہاں سے اور سنو آئندہ تم.....“ وہ بات ادھوری چھوڑ کر الماری کی طرف بڑھ
گیا تو وہ منتظر کھڑی رہی۔ جب وہ کپڑے نکال کر پلٹا تو اُسے دیکھ کر تعجب سے بولا۔
”تم ابھی تک نہیں گئیں؟“

”آپ کچھ کہہ رہے تھے۔“ اُس نے یاد دلانا چاہا لیکن وہ فوراً بول پڑا۔

”میں نے تمہیں جانے کے لیے کہا ہے اور بس۔“

”اچھا۔“ لا پرواہی سے ذرا سے کندھے اُچکاتی ’وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی اور وہ
اُس کی پشت پر لہراتی ناگن پر سے فوراً نظریں نہیں ہٹا سکا تھا۔
رات کو وہ لٹاں سے الجھنے لگی کہ بیگم کو دو چار نوکر اور رکھ لینے چاہیں۔ اتنا سارا کام ان
دونوں کے سر پر ڈال دیا ہے۔“

”بیٹا! شادی کا گھر ہے کام تو بڑھ ہی جاتا ہے۔ پھر کچھ دنوں کی بات ہے۔“ لٹاں نے
رسان سے سمجھانا چاہا لیکن وہ اُسی طرح منہ پھلا کر بولی۔

قدرے مطمئن ہو کر کمرے کا جائزہ لیا۔ بالکل رُشنا کے کمرے کی طرح ہر شے بکھری ہوئی تھی۔

اُس نے دھیرے دھیرے سب سمیٹنا شروع کیا۔ میلے کپڑے واش روم میں لٹکائے۔
صوفے پر تولیہ جیسے سوکھنے کے لیے رکھا گیا تھا، اسے اسٹینڈ پر ڈالا۔ بیڈ پر دو تین فائلیں کھلی رکھی
تھیں، اور کھڑکی سے آتی ہوا سے صفحے احتجاج کرتے لگ رہے تھے۔ ایش ٹرے رائٹنگ ٹیبل پر
راکھ اُڑا رہی تھی۔ وارڈروب کھلی ہوئی تھی۔

وہ پہلے ہی کچن میں تین گھنٹے کھڑی ہونے کے باعث تھکی ہوئی تھی۔ اس لیے اتنا
پھیلاؤ اور گرد دیکھ کر جھنجھلا گئی لیکن کام تو کرنا ہی تھا۔ بس اپنے آپ بڑبڑاتی رہی۔ آدھ گھنٹے میں
کمرہ صاف ہو گیا تو وہ فوراً نیچے جانے کی بجائے وہیں ٹیبل کے پاس نیچے گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ محض
کچھ دیر سستانے کی غرض سے کیونکہ جانتی تھی کہ نیچے کوئی اور کام منتظر ہوگا۔ یہ خیال بھی تھا کہ کہیں
کوئی آنے جائے۔ اس لیے خود کو مصروف ظاہر کرنے کی خاطر گلدستے میں سے سارے کاغذی
پھول نکال کر ایک ایک کر کے اور بہت آرام آرام سے دوبارہ سجانے لگی۔ جب آس پاس کوئی نہ
ہو اور ذہن پر کسی سوچ کا پہرہ بھی نہ ہو تو آپ ہی آپ کوئی گیت ہونٹوں پر چل جاتا ہے۔
رات فرح کی سہیلیاں ڈھولگ پر جو گیت گارہی تھیں، وہی گنگناٹے لگی۔

نجر لاگی راجہ تورے بنگلے پر
میں جو ہوتی راجہ کالی بدریا
برس رہتی راجہ تورے بنگلے پر
بڑی گن سی تھی جیسے اُسے اور کوئی کام ہی نہیں۔ بہت سوچ سوچ کر ایک پھول
اُٹھاتی، کچھ دیر اُسے انگلیوں میں دباتی پھر گلدستے میں سجا دیتی۔ پتہ بھی نہیں چلا کب اندر آتے
ہوئے اُسے دیکھ کر وہ دروازے ہی میں رُک گیا۔ پرفسوں لمحات..... اس پر اُس کی گنگناہٹ نے
قیامت ڈھادی۔

میں جو ہوتی راجہ توری دلہنیا

لٹاں نے اس کا عذر نہیں مانا۔ اور وہ روٹھی ہوئی سی گٹھڑی پھینک کر چلی آئی۔ پہلے رُشنا کے کمرے میں جھانک کر دیکھا، وہ وہاں نہیں تھی۔ پھر ہال کی طرف آرہی تھی کہ برآمدے میں صاحب نے روک لیا۔

”تمہاری لٹاں کہاں ہے؟“

”اپنے کوارٹر میں۔“

”طبیعت تو ٹھیک ہے ناں اُس کی؟“ انہوں نے جیسے بات کرنے کی غرض سے پوچھ

لیا۔

”جی۔“

”اچھا اچھا، تم ادھر لڑکیوں کے پاس چلی جاؤ۔ سب تمہارے ساتھ کی لڑکیاں ہیں۔“ وہ کہتے ہوئے آگے بڑھے، لیکن پھر ایک دم قدم روک کر بولے۔ ”سنو بیٹا! تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟“

”جی!“ اُس نے چونک کر حیران ہو کر دیکھا تو پلٹ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اور وہ اُلجھتے ہوئے ہال کمرے میں آگئی۔ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی کہ رُشنا نے پکار لیا۔

”کلثوم! یہاں آؤ۔“ اسے چکر کاٹ کر رُشنا تک آنا پڑا۔ اسی اثناء میں سب لڑکیاں اُس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں۔ ایک نے پوچھ لیا۔

”کون ہے؟“

”یہ کلثوم ہے۔“ رُشنا نے اُس کے تعارف میں اسی قدر کہا۔ اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بیٹھا لیا۔

”سوری رُشنا! اگر یہ کوئی مشہور شخصیت ہے جس کا نام ہی کافی ہے، تب بھی ہم نہیں سمجھے..... مکمل تعارف کراؤ۔“ ایک لڑکی نے اُس کے سادہ و معصوم چہرے کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا تو رُشنا سے پہلے روٹی بول پڑی۔

”کچھ دنوں کی بات ہو یا بہت دنوں کی..... مجھ سے نہیں ہوتا۔“

”بری بات.....! ایسے نہیں کہتے اور کیا تم اپنے گھر میں سارا کام نہیں کرتی تھیں؟“

”اپنے گھر کی بات اور ہوتی ہے لٹاں!“

”اسے بھی اپنا گھر سمجھو۔ اس گھر نے ہمیں پناہ دی ہے۔“ پھر فوراً بات بدلتے ہوئے

کہنے لگیں۔ ”خیر چھوڑو! وہ گٹھڑی اٹھالاؤ۔ دیکھو میں تمہارے لیے کپڑے لائی ہوں۔“

”کہاں سے؟“ وہ گٹھڑی اٹھا کر جلدی جلدی کھولنے لگی لیکن پھر قدرے شوخ رنگوں

کے سلکن کپڑے دیکھ کر حیرت سے بولی۔ ”یہ میں پہنوں گی؟“

”ہاں، فرح کی شادی میں پہننا۔“

”آپ بھی کمال کرتی ہیں لٹاں! بھلا ہم نوکر لوگ.....“

”تم نوکر نہیں ہو۔“ لٹاں نے فوراً کچھ اس انداز سے ٹوکا کہ وہ مزید حیران ہو کر دیکھنے

لگی۔ تب لٹاں اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے کر بولیں۔ ”اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ تم کسی سے کم نہیں ہو۔“

”بس کریں لٹاں! آپ ماں ہیں ناں، اور ہر ماں کو اپنی اولاد سب سے زیادہ اچھی لگتی

ہے۔“

وہ بے دلی سے کپڑوں کو دوبارہ گٹھڑی میں باندھنے لگی۔ تبھی دروازے پر سے رحمت

بابا پکار کر بولے۔

”بوا! کلثوم کو بھیج دو رُشنا بی بی بلا رہی ہیں۔“ اس نے رحمت بابا کی پوری بات سُن کر

لٹاں کو دیکھا تو وہ بڑے آرام سے بولیں۔

”جاؤ رُشنا بلا رہی ہے۔“

”لٹاں! اتنی رات ہو گئی ہے۔“

”تو کیا ہوا؟ ابھی سب جاگ رہے ہیں۔ دیکھو ڈھولک کی آواز بھی آرہی ہے۔“

دیا۔ دل چاہا کسی بہانے فوراً اتر جائے، لیکن رُشنا نے بیٹھے ہی کہہ دیا۔

”بہت دیر ہو گئی ہے سیف بھائی! بس اب جلدی چلیں۔“

”اور وہ اولڈ کیل۔“ اُس کا اشارہ ماں باپ کی طرف تھا۔ رُشنا ہنس کر بولی۔

”وہ اپنی گاڑی میں آرہے ہیں۔“

اُس نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی۔ اور حقیقتاً وہ اُسے کوئی اہمیت نہیں دینا چاہتا تھا لیکن اگر ہر بات اختیار میں ہو جائے تو پھر بے اختیاری کے کہیں.....! وہ تو اُس روز سے خود کو سمجھا رہا تھا، جب اپنے کمرے میں اُسے گنگنا تے سنا تھا۔ حالانکہ اُس کی آواز میں کوئی جادو نہیں تھا لیکن وہ گرفت میں آ گیا تھا کہ اُس روز سے اب تک اُس کی ساعتوں میں بس اُس کی آواز تھی۔

میں جو ہوتی راجہ توری دلہنیا
منک رہتی راجہ تورے بنگلے پر

اور جہاں وہ تنہا ہوتا، جانے وہ کون سے روپ دھار کر سامنے آتی تھی۔ کتنی دیر تک وہ اطراف سے بیگانہ ہو جاتا اور جب سر جھٹکتا تو اپنے آپ سے نادم کہ اب وہ ایسا ہی گیا گزرا ہے کہ ایک ملازمہ کو سوچنے لگا ہے اور اگر کسی نے اس کے خیال تک رسائی حاصل کر لی تو اُسے کتنا ہرٹ کیا جائے گا۔ ماما تو کسی صورت نہیں بخشیں گی۔

”سیف الرحمن! تم اونچے بنگلے میں رہنے والے ویل ایجوکیٹڈ ویل مینر ڈسوسائٹی میں تمہارا مقام ہے اور تم نے اپنے مقام سے اتنا نیچے گرنے کا تصور کیسے کیا؟“

اُسے ماما پھنکارتی ہوئی محسوس ہوئیں اور سچ سچ وہ اپنے مقام سے نیچے آنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اندر سے کمزور اور بزدل تھا۔ خود سے اعتراف کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ زمانے کا سامنا کرنا تو اور مشکل تھا۔ اور ان ساری باتوں کے باوجود وہ خود پر اختیار کھو چکا تھا۔

ویسے سے واپسی پر گاڑی سے اترتے ہی وہ اپنے گھلے بالوں کو سمیٹ کر جلدی جلدی چوٹی گوندھنے لگی اور چاہتی تھی کہ فوراً اپنے کوارٹر کا رخ کرے کہ روبی نے چائے کا کہہ دیا۔

”یہ ہماری ملازمہ ہے۔“

”کیا.....!“ سب ایک ساتھ چیخیں۔ ”مذاق نہیں کرو۔“

”پوچھ لو اُس سے۔“

”واقعی.....!“ سب نے اس سے تصدیق چاہی اور وہ بڑے آرام سے بولی۔

”روبی ٹھیک کہہ رہی ہے میں نوکر ہوں۔“

”بکومت.....!“ رُشنا نے اُسے ڈانٹ دیا۔ پھر کہنے لگی۔ ”پاگل ہو تم سب..... روبی

کی بات کا یقین کر لیا اور روبی! یہ کیا بد تمیزی ہے؟“

”لیجیے.....“

”اچھا بس.....! آؤ کلثوم تم ڈھولک بجاؤ، ہم سب گائیں گے۔“ رُشنا نے ڈھولک کھینچ

کر اُس کے سامنے رکھ دی۔

پھر مہندی، بارات، ولیمہ، ہر فنکشن میں اتناں نے اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر وہی کپڑے پہنے پر مجبور کیا جو وہ اُس کے لئے لائی تھیں۔ اور وہ تو عام سے کپڑوں میں بھی غضب ڈھاتی تھی۔ ذرا سی ج دھج نے اُسے سب کی نگاہوں کا مرکز بنا دیا تھا اور وہ اتنی بے خبر نہیں تھی لیکن اپنی اوقات نے اُسے کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونے دیا۔ پھر کچھ بیگم کی تیکھی نظریں تھیں، جو وہ اتناں کی خواہش کے باوجود خود کو سب کے برابر نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے باوجود رُشنا نے اُس کے بال کھول دیئے اور اپنے ساتھ لے کر گاڑی کی طرف بڑھی تو بیگم نے روک کر اُس سے پوچھا۔

”تم بھی جا رہی ہو؟“ وہ شپٹا گئی فوراً کوئی جواب بھی نہیں دے سکی۔ جبکہ رُشنا اپنی

دھن میں آگے نکل گئی تھی۔ تب صاحب نے اُس کی مشکل آسان کر دی۔

”ہاں ہاں..... یہ کیوں نہیں جائے گی۔ جاؤ دیکھو رُشنا بلارہی ہے۔“

اُس نے پلٹ کر دیکھا واقعی رُشنا اشارے سے بلارہی تھی۔ وہ تیز قدموں سے اُس

کے پاس آ گئی۔ بہت نزوس ہو گئی تھی۔ مزید و یومر سے جھانکتی، مشتاق نظروں نے پریشان کر

”کیا کہا؟“

”میرا دوپٹہ.....“ اُس نے جلدی سے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔

”اوہ سوری۔“ اُس نے اپنا جوتا ذرا سا اونچا کیا تو وہ فوراً اپنا آنچل کھینچ کر پیچھے ہٹ

گئی اور جانے لگی کہ وہ پکار کر بولا۔

”سُنو..... وہ ایسا ہے کہ تم صاحب نہ کہا کرو۔“

”پھر.....؟“ وہ سادگی سے دیکھنے لگی تو قدرے رُک کر بولا۔

”رہبہ کہہ لیا کرو۔“

”رہبہ.....“ وہ نا سمجھی کے عالم میں تھی۔ اور وہ آپ ہی آپ محظوظ ہو کر مسکرایا۔ پھر

چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا تو وہ جلدی سے اُس کے کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

گو کہ ابھی وہ ایسی عمر میں تھی جب بچپن میں سنی ہوئی کہانیوں کے شہزادے اچانک

خوابوں کی سرزمین پر دوڑنے لگتے ہیں۔ لیکن ایک تو حالات نے اُسے اندر سے سہا کر رکھ دیا تھا۔

دوسرے اب اپنی کم مائیگی کا احساس تھا جو وہ قصداً ان راہوں سے نظریں چرا رہی تھی جن پر سیف

الرحمن بہت چپکے سے اُس کے لیے کوئی خواب رکھ چھوڑا تھا۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں غلطی سے بھی اُس

نے کوئی خواب آنکھوں میں سجایا تو پھر اُس کے اور امتاں کے لیے یہ ٹھکانا بھی نہیں رہے گا۔ اور

ڈرتا تو وہ بھی تھا لیکن بہر حال مرد تھا اور اُسے بہت چور راستوں کی خبر تھی۔ اس لیے پہلے اشارے

کنائے سے اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کسی طرح وہ متوجہ نہیں ہوئی تب اُس روز

پہلے ہی مقام پر اُس کی کلائی تھام گیا۔

”تم سمجھتی کیا ہوا اپنے آپ کو؟“

”جی.....!“ وہ حیران کم پریشان زیادہ تھی۔

”مت انجان بنو.....! میرے دل کی دنیا تمہو بالا کر کے اتنے اطمینان سے کیسے ہو

”کھٹوم! چائے بنا دینا اور ذرا جلدی۔“ اس نے بہت خاموشی سے روٹی کا حکم سنا پھر

رُشنا سے پوچھا۔

”آپ بھی پیس گئی؟“

”نہیں۔“ وہ منع کرتے ہوئے آگے بڑھ گئی اور قریب سے گزرتے ہوئے وہ کہہ گیا۔

”میں ضرور پیوں گا۔“

وہ کچن میں آکر چائے بنانے لگی۔ پھر پہلے روٹی کا کپ لے کر اُس کے کمرے کی

طرف جا رہی تھی کہ صاحب اور بیگم جو غالباً اُسی وقت آرہے تھے اُس کے ہاتھ میں کپ دیکھ کر

انہوں نے بھی فرمائش کر ڈالی۔ وہ اندر ہی اندر جھنجھلاتے ہوئے روٹی کو چائے دے کر دوبارہ کچن

میں آگئی۔ ٹی پاٹ کا جائزہ لیا۔ اس میں مزید ایک کپ چائے تھی۔

اس نے جلدی سے ٹرے میں کپ رکھ کر چائے ڈالی اور جو سیف کے لیے بنا چکی تھی وہ

بھی ٹرے میں رکھ کر بیگم کے کمرے میں دے آئی۔ پھر آکر نئے سرے سے پانی رکھا اور اُس کے

کھولنے کا انتظار کرنے لگی۔

ایسے ہی موقعوں پر اُسے شدت سے اپنا گھریا داتا تھا۔ اور گھر چھوٹا سہی لیکن اپنی

حکمرانی تو تھی۔ کسی کام میں کوئی زبردستی نہیں اور یہاں دل نہ چاہ رہا ہو یا تھکن سے بدن چور

ہو..... تب بھی کرنا ہے۔ بہر حال وہ اُس کے لیے چائے لے کر اوپر آئی تو اُس کے انداز میں عجلت

کے ساتھ قدرے بیزار ی بھی تھی۔

وہ صوفے پر بیٹھا بظاہر میگزین دیکھنے میں مصروف تھا۔ اُس نے جیسے ہی جھک کر چائے

کا کپ اُس کے سامنے ٹیبل پر رکھا۔ وہ اُس کے فرش پر جھولتے آنچل کو اپنے جوتے تلے دبا گیا اور

وہ سیدھی ہوئی تو سلکی کپڑوں پر آنچل پھسلا چلا گیا۔ وہ فوراً تھام کر بولی۔

”صاحب! میرا دوپٹہ چھوڑیں۔“ وہ محض اُسے دیکھنے کی خاطر بالکل ان سنی کر کے براہ

راست اُسے دیکھنے لگا۔

تم.....؟

”پتہ نہیں کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“ وہ رو دینے کو ہو گئی۔

”بہت اچھی طرح جانتی ہوں تم۔ میں تمہارے ساتھ مذاق نہیں کر رہا، نہ کوئی کھیل کھیل رہا ہوں۔ محبت کرتا ہوں تم سے۔“

اعتراف بھی کر رہا تھا تو انتہائی غصے کے عالم میں اور وہ ہاتھوں میں چہرہ چپا کر رو پڑی۔

”بس کریں صاحب! بیگم کو پتہ چل گیا تو کھڑے کھڑے نکال دیں گی۔“

اور اگر وہ کہہ دیتا کہ ساری دنیا کو پتہ چل جائے پروا نہیں، تو شاید اُس کی روانی سے بہتے اشک تھم جاتے لیکن وہ خاموش ہو کر رہ گیا۔ جیسے خود بھی اس بات سے خائف ہو۔ پھر کہنے لگا۔

”مجھے خود احساس ہے ماما کو معلوم ہو گیا تو۔ خیر چھوڑو اس بات کو اور دیکھو رونا بند کرو۔ مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔“

وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔ بیگم کی ہیل کی ٹک ٹک سنائی دی۔ شاید اسی طرف آرہی تھیں اور وہ جلدی سے بولا۔

”اب نہیں رونا۔ سمجھیں.....!“

اس کے ساتھ ہی کچن کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اُس نے حیران ہو کر دیکھا پھر بیگم کی نظروں سے بچنے کے لیے برتن دھونے لگ گئی۔

اور پھر بے آب و گیاہ زندگی میں اگر ہر قدم پھول کھلنے لگے تھے تو وہ کہاں تک اُن سے نظریں چراتی۔ گو کہ اُس نے کبھی محلوں کے خواب نہیں دیکھے تھے اور یہ تو قسمت کی بات تھی۔ محلوں کا راجہ تو خود چل کر آیا تھا۔ ہزار خائف سہی پھر بھی محبتوں کا اعتراف پوری سچائیوں کے ساتھ کرتا تھا۔

”یہ صحیح ہے کلثوم کہ میں سب کے سامنے تمہارا ہاتھ نہیں تھام سکتا، لیکن یقین رکھنا کہ میں کبھی تمہارا ہاتھ نہیں چھوڑوں گا۔“

”آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“ وہ بہت نادان نہیں تھی پھر بھی نہیں سمجھ پائی۔

”اس میں نہ سمجھنے کی کیا بات ہے۔ تم جانتی ہو ماما، بلکہ میرے گھر میں کوئی بھی یہ پسند نہیں کرے گا کہ میں تمہیں.....“ وہ قصداً خاموش ہو گیا تو کچھ دیر انتظار کے بعد وہ کہنے لگی۔

”میں جانتی ہوں صاحب۔ میرا آپ کا کوئی جوڑ نہیں اور جب آپ کو بھی معلوم تھا تو پھر مجھے خواب کیوں دکھائے؟“

”خواب دکھائے ہیں تو تعبیر دوں گا لیکن اس کے لیے تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔“

”میں تو انتظار میں عمر بتا سکتی ہوں صاحب۔“

”اوں ہوں.....! کتنی بار منع کیا ہے صاحب نہیں کہا کرو۔“ اُس نے ٹوکنے کے ساتھ قدرے شوخی سے پوچھا۔ ”کیا کہو گی؟“

”رہے.....!“ وہ دھیرے سے مسکرائی اور اُس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی نیچے آئی تو سامنے سے آتی رشنا سے ٹکرائی۔

”ارے رے..... یہ اتنی بدحواس کیوں ہو رہی ہو؟“ رشنا بمشکل سنبھل کر پیچھے ہٹے ہوئے بولی تو گھبراہٹ میں اُس کے منہ سے التماسیدھا نکلنے لگا۔

”وہ میں اوپر صفائی کرنے گئی تھی لیکن راجہ میرا مطلب ہے وہاں چھوٹے صاحب ہیں۔“

”چھوٹے صاحب تمہیں کیا کھا جائیں گے؟ کچھ کہا انہوں نے؟“

”نن..... نہیں تو۔“

”ہاں وہ کیا کہیں گے بھلا۔ خیر تم صفائی وغیرہ بعد میں کر لینا۔“

”نہیں ہوا.....! آپ بیٹھیں آرام سے۔ یوں بھی میں کھانا کھا چکا ہوں۔ بس اس لیے چلا آیا کہ گھر میں بہت خاموشی ہے۔ ماما کہاں ہیں؟“

”کچھ بتا تو رہی تھیں بیگم..... میں نے ٹھیک سے سنا نہیں۔ شاید تمہارے لیے کوئی لڑکی دیکھنے گئی ہوں گی۔ آج کل تو ان پر بس یہی دھن سوار ہے۔“

”اچھا!“ انماں کی بات پر وہ اشتیاق ظاہر کرتا ہوا ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ پھر کن اکھیوں سے اُسے دیکھ کر بولا۔ ”واقعی اب میری شادی ہو جانی چاہیے۔“

”بیگم بھی یہی چاہتی ہیں۔“

”ماما چاہتی تو ہیں لیکن۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا پھر اُس کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔ ”ہوا! آپ اس کی شادی کب کر رہی ہیں؟“

”دعا کرو بیٹا! اللہ جلد ہی وہ گھڑی لائے۔ میں نے صاحب سے بھی کہا ہے کہ کوئی اچھا لڑکا دیکھیں اس کے لیے۔“

اُس کی شادی کے ذکر پر انماں ایک دم سنجیدہ ہو گئیں جبکہ وہ شریر ہو رہا تھا۔ اُس کے گھورنے کے باوجود باز نہیں آیا۔

”مجھ سے کہا ہوتا ہوا! میں اب تک بیسیوں لڑکے آپ کو دکھا چکا ہوتا۔“

”اللہ بھلا کرے تمہارا۔ کوئی ہے تمہاری نظر میں.....؟“ انماں پوری طرح اُس کی طرف متوجہ ہو گئیں تو وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

”ہاں ہے تو سہی ایک لڑکا لیکن.....“

”لیکن کیا؟“ انماں نے انتہائی بے صبری کا مظاہرہ کیا۔ تبھی گاڑی کے ہارن پر وہ بولکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے بولا۔

”میرا خیال ہے ماما آگئی ہیں۔ میں پھر آپ سے بات کروں گا ہوا۔ آپ فکر نہیں کریں۔“

اُس نے ذرا سا سر ہلانے پر اکتفا کیا اور جلدی سے کچن میں آگئی۔ اب اسے کوئی کام برا نہیں لگتا تھا۔ پتہ نہیں انماں کس حساب سے کہتی تھیں کہ اپنے آپ کو نو کر نہیں سمجھو اور اب وہ سچ بچ خود کو کچھ اور سمجھنے لگی تھی۔

محبت کی راہ گزر رہی ایسی ہے جس میں اگر پھول کم خار زیادہ ہوں تب بھی ابتدائی مراحل میں نظر صرف پھولوں پر ہی ٹھہرتی ہے۔ وہ بھی بڑی گن سی محبتوں کی کلیوں سے دامن بھرتی چلی آرہی تھی۔ حالانکہ دو ایک بار ناشتے کی ٹیبل پر وہ بیگم کو یہ کہتے ہوئے سن چکی تھی کہ وہ رُشنا اور سیف کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتی ہیں اور سیف کے لیے وہ لڑکیاں بھی دیکھ رہی ہیں لیکن اُس نے پروا نہیں کی کیونکہ وہ اُسے یقین دلا چکا تھا کہ وہ صرف اُس کا ہے اور اُسی کا ہی رہے گا۔

اُس وقت بیگم گھر پر نہیں تھیں۔ اس لیے دوپہر کے تمام کاموں سے فارغ ہوتے ہی وہ انماں کے ساتھ کوارٹر میں آگئی۔ رُشنا اور روبی کو دوپہر میں لمبی تان کر سونے کی عادت تھی اس لیے بھی اطمینان تھا کہ کسی کام کے لیے پکارا نہیں جائے گا۔

”انماں! آپ بھی کچھ دیر آرام کر لیں۔ تھک جاتی ہوں گی۔“

اُس نے زبردستی انماں کو لینے پر مجبور کیا۔ پھر شاہر میں سے اپنا دوپٹہ نکال کر کاڑھنے لگ گئی۔ کچھ دیر بعد ہی سیف کی آواز سنائی دی۔ غالباً دروازے پر رک کر پکار رہا تھا۔

”ہوا.....“ اُس کا دل یکبارگی بڑی زور سے دھڑکا کن اکھیوں سے انماں کو دیکھا۔ وہ اٹھتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”ارے یہ تو سیف میاں کی آواز ہے۔ آجاؤ بیٹا اندر آ جاؤ۔“

اُس نے ایسی ہی جھکی ہوئی نظروں سے اُسے آتے ہوئے دیکھا۔ پھر بظاہر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”آج جلدی آگئے بیٹا۔ کھانا نکال دو؟“ انماں یہی سمجھیں کہ وہ اسی غرض سے آیا ہے لیکن اس نے منع کر دیا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی اور چپکے سے پلوں تک آئی نہی کو صاف کرنے لگی۔

”ارے! تم تو ناراض ہو گئیں۔ پگلی کوئی ماں سے بھی ناراض ہوتا ہے۔“ لٹاں نے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔

”آپ بھی تو مجھے کوئی بات بتائیں۔ اتنے دنوں سے پریشان پھر رہی ہیں۔“ اس نے بالآخر ٹوک دیا۔

”میں پریشان ہوں.....!“ لٹاں نے جیسے خود سے کہا۔ پھر اس سے بولیں۔ ”پریشان نہیں ہوں بیٹا بس..... اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔“

”بتائیں ناں!“ اس نے چل کر اصرار کیا تو کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد لٹاں کہنے لگیں۔

”تمہیں پتہ ہے ناں کہ تمہارے ابا میاں کے ایک بھائی بھی ہیں۔ میں نے بھی صرف ان کا نام سنا تھا یا پھر ایک بار بس تمہاری دادی کے انتقال پر دیکھا تھا۔ تمہارے ابا میاں بتاتے تھے کہ انہیں شروع ہی سے بڑا آدمی بننے اور کھلوانے کا شوق تھا۔ اس شوق میں باہر نکل گئے۔ جانے کتنا عرصہ باہر رہ کر واپس آئے تو اپنا کاروبار شروع کیا لیکن قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ جو کم کر لائے تھے وہ سب ڈوبنے لگا لیکن ہوشیار آدمی تھے..... اس سے پہلے کہ کنگال ہو جاتے ایک بڑے گھر میں شادی کر لی اور سرسری مدد سے نہ صرف یہ کہ ان کا کاروبار بالکل ٹھپ ہونے سے بچ گیا بلکہ انہوں نے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ لیکن ان کی بیوی ہولٹیا عورت تھی۔ پھر یہ بھی جانتی تھی کہ سب کچھ اس کے باپ کا دیا ہوا ہے اس لیے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

ان دنوں تمہارے ابا میاں اور تمہاری دادی انہی کے پاس رہتے تھے اور جو سلوک وہ عورت تمہاری دادی کے ساتھ کرتی تھی وہ تمہارے ابا میاں سے برداشت نہیں ہوا اس لیے وہ ماں کو لے کر اپنے اسی چھوٹے گھر میں چلے گئے۔ اور تمہارے تایا ابا بزدل آدمی تھے۔ کبھی پلٹ کر

اُس کے ساتھ ہی تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا تو وہ جو خود کو انجان ظاہر کر رہی تھی اُس کے جاتے ہی لٹاں کو دیکھنے لگی تو وہ آہ بھر کر بولیں۔

”قسمت کی بات ہے اگر آج ہم پیسے والے ہوتے تو بیگم کو اس کے لیے ادھر ادھر لڑکی نہ تلاش کرنا پڑتی۔“

”کیا مطلب؟“ اُس نے چونک کر پوچھا لیکن لٹاں اپنی ہی سوچ میں تھیں اور جیسے اپنے آپ سے بولیں۔

”صاحب کا بھی تو کچھ زور نہیں چلتا ورنہ ہم ملازموں کے کوارٹر میں پڑے ہوتے.....!“

”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“ وہ الجھ کر قدرے زور سے بولی تو لٹاں چونک کر اُسے دیکھنے لگیں۔ پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔

”کچھ نہیں تم اپنا کام کرو۔ میں ذرا بیگم کے پاس ہواؤں شاید انہیں کوئی کام ہو۔“

☆☆☆

یونہی کتنے دن گزر گئے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ لٹاں شدت سے اس کی منتظر ہیں کہ کسی دن وہ پھر اس طرف آنکلتے تو لٹاں اس سے تفصیلی بات کریں لیکن وہ نہیں آیا اور آپ اس نے محسوس کیا کہ لٹاں اس کا انتظار چھوڑ کر کسی اور الجھن میں ہیں۔ جانے کیسی الجھن تھی جس نے انہیں گم کر دیا تھا۔ کسی بھی بات کو اسے بار بار دہرانا پڑتا پھر انہیں جھنجھوٹی تب کہیں جا کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوتیں۔ کتنے دن وہ ان کی اس کیفیت پر جھنجھلاتی رہی۔ اس روز ٹوکے ہوئے روہانسی ہو گئی۔

”لٹاں! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ میری بات کیوں نہیں سنتیں۔“

”تمہاری نہیں سنوں گی تو کس کی سنوں گی بیٹا۔“ اس کے روہانسی ہونے پر لٹاں نے اس کا سراپنی گود میں رکھ لیا۔ اور دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے بولیں۔ ”کہو کیا کہہ رہی تھیں؟“

”بتائیں ناں اناں..... آپ گئی تھیں ان کے پاس؟“

”اور کہاں جاتی۔ کون تھا ہمارا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا لوگوں نے ہم پر زندگی تنگ کر دی تھی۔“ اپنی بے بسی پر اناں کے آنسو چھلک گئے تھے۔ دوپٹے میں جذب کرتے ہوئے بولیں۔

”مایوسی کے اندھیروں میں مجھے ایک کرن نظر آئی تھی اور میں نے سوچا تمہارے تایا اتنا کتنے سنگدل سہی، یتیم بھتیجی کے سر پر ہاتھ تو رکھ ہی دیں گے۔ یوں تمہاری خاطر میں ان کے پاس چلی گئی۔ انہیں تمام حالات بتائے کہ تمہارے ابا میاں کے انتقال کے بعد لوگوں نے کسی طرح اکیلی عورتوں کا جینا حرام کر رکھا ہے۔“

”پھر کیا کہا انہوں نے؟“ اناں کے ذرا سار کئے پر اس نے بے صبری سے پوچھا۔

”بس بیٹا! بڑی مشکلوں سے وہ ہمیں سر چھپانے کی جگہ دینے پر آمادہ ہوئے وہ بھی اس شرط پر کہ ان کی بیگم کو پتہ نہ چلے۔ کیونکہ وہ عورت ابھی بھی ان کے غریب رشتے داروں سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ بہر حال میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ ہم کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔ کبھی خود کو ظاہر نہیں کریں گے۔“

”آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیے تھا اناں! ہم یہاں ٹھیک تو ہیں۔“ اسے بہت دکھ ہوا تھا۔

”میں اب کی نہیں اس وقت کی بات کر رہی ہوں بیٹا جب ہم اپنے گھر میں تھے۔“ اناں کی سمجھ میں نہیں آیا اسے کیسے سمجھائیں۔ واقعی عجیب سا لگ رہا تھا۔ نظریں چراتے ہوئے بولیں۔ ”تمہارے تایا اتنا سے بات کرنے کے بعد ہی تو میں تمہیں لے کر یہاں آئی ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ پھر جیسے آپ ہی آپ سمجھ میں آ گیا تو انتہائی تاسف میں گھر کر بولی۔ اناں یہ..... یہ گھر۔ میرا مطلب ہے کیا یہ تایا اتنا..... اور وہ

انناں عہد رفتہ کو دہراتے ہوئے وہیں کھوئی ہوئی تھیں۔ ذرا دیر کو چپ ہوئیں تو پھر چپ بیٹھی رہ گئیں جبکہ نگاہوں میں ایک ایک منظر گھوم رہا تھا۔ اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک ماں کو تایا اتنا کا خیال کیسے آ گیا۔ دل چاہا پوچھے لیکن پھر خاموش رہی اور کتنی دیر بعد اناں پھر کہنے لگیں۔

”جب میں شادی ہو کر آئی تو اکثر تمہاری دادی کو بڑے بیٹے کے لیے مغموم دیکھا پھر بھی ان کے پاس جانا نہیں چاہتی تھیں۔ بس انہیں یہی دکھ تھا کہ بڑا بننے کے جنون میں ان کے بیٹے نے اپنا آپ بچ ڈالا۔ کہتی تھیں وہ پیسے والا ہو کر بھی غلام کا غلام ہے۔ پھر ان کے انتقال پر میں نے بھی اس شخص کو دیکھا تو مجھے بہت دکھ ہوا تھا کہ ماں کے مرنے پر کس طرح اجنبیوں کی طرح آیا تھا۔ تمہارے ابا میاں کے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھے تو ایسے شخص سے بھلا کیا امید رکھی جاسکتی تھی۔ جب تمہارے ابا میاں گردوں کی بیماری میں مبتلا ہوئے تو میں نے مشین سنبھال لی۔“

مجھے اور تمہارے ابا میاں کو بھی یہ گوارا نہیں تھا کہ ہم ان سے مدد مانگیں۔ پھر جس شخص کو اپنی ماں کا خیال نہیں تھا وہ ہمارا کیا خیال کرتا۔ بہر حال وقت جیسا بھی ہو گزر جاتا ہے لیکن پتہ نہیں کیوں کبھی کبھی وقت ہمیں اسی راستے پر لا کھڑا کرتا ہے جس سے ہم گزرنا نہیں چاہتے۔ اسے تقدیر کی ستم ظریفی کہوں یا کوئی اور آزمائش۔ کچھ بھی ہے..... ساری آزمائشوں سے کڑی آزمائش ہے کہ جب ساری دنیا اجنبی ہو گئی ہمارے لیے اپنے ہی گھر کی دیواریں کمزور پڑ گئیں تو انتہائی مایوسی کے عالم میں مجھے خیال آیا بھی تو اسی در کا جہاں سے تمہارے ابا میاں اور دادی اس طرح دلبرداشتہ ہو کر نکلے تھے کہ دوبارہ اس طرف نہ آنے کی قسم کھالی تھی۔

انناں کی آواز بوجھل ہو کر خاموش ہو گئی تو وہ جو دم سادھے پڑی تھی ایک دم پوچھنے لگی۔

”آپ تایا اتنا کے پاس گئی تھیں؟“ اناں فوراً جواب نہیں دے سکیں تو وہ ان کے ہاتھ

”نہیں! آپ بتائیں کیا بات ہے۔ اب میں پریشان نہیں ہوں گی۔“

اس نے پھر مجھ پر اقرار کیا تو لٹاں نے پھر سے اس کا سراپنی گود میں رکھ لیا اور قدرے توقف کے بعد کہنے لگیں۔

”اب کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ وہ ایک روز سیف نے کہا تھا کہ تمہارے لیے ایک رشتہ بتائے گا۔ بعد میں موقع ملنے پر میں نے پوچھا تو کہنے لگا وہ خود تم سے شادی کرے گا۔“

”میرے خدا!.....“ ٹھہرے ہوئے دل میں ہلچل سی جھج گئی اور ایسی ہی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساتھ پوچھا۔ ”کیا انہیں معلوم ہے لٹاں کہ ہم.....“

”نہیں بیٹا!“ لٹاں فوراً بولیں۔ ”کسی کو معلوم نہیں ہے سوائے تمہارے بتایا ابا کے۔ اور ان سے میں وعدہ کر چکی ہوں۔ تم بھی خیال رکھنا کبھی کسی کو خود سے اپنے بارے میں نہیں بتانا۔“

”میں کیوں بتاؤں گی۔ اور لٹاں سیف سے آپ نے کہا نہیں کہ ہمارا ان کا کیا جوڑ.....!“ وہ پھر اصل بات کی طرف آگئی۔

”کہا تھا بیٹا بلکہ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن وہ جو بات منہ سے نکال چکا تھا اس سے نہیں ہٹا۔ ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کیا کہ اس کے ماں باپ اس رشتے پر کبھی راضی نہیں ہوں گے اور انہیں راضی کرنا تو دور کی بات وہ تو ان سے کہنے کی ہمت بھی نہیں رکھتا۔ عجیب الجھن میں ڈال دیا ہے اس لڑکے نے مجھے۔“

☆☆☆

موسم سرما کا اختتام ہوتے ہی بہاروں کے قافلے اترتے چلے آئے۔ اور سارے موسم تو انسان کے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ بس یہ اتفاق ہی تھا کہ ان دنوں اندر باہر کا موسم ایک جیسا تھا۔ اگر لان کے گوشے گوشے میں کلیاں جھج رہی تھیں تو اس کے من کا آنگن بھی مہکا مہکا تھا۔ اس وقت پودوں کو پانی دیتے ہوئے وہ بہت دھیرے دھیرے کچھ گنگنا بھی رہی تھی۔ تبھی پیچھے سے آکر اس نے اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے تو وہ حواس باختہ سی ہو کر فوراً دور ہٹ گئی۔ اور سہمی ہوئی

”آرام سے بیٹا۔ میں تمہیں یہی تو بتانا چاہ رہی ہوں کہ صاحب ہی تمہارے تایا.....“

”نہیں لٹاں! آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ بھلا ابا میاں کے بھائی.....“ دکھ اور بے یقینی کی کیفیت میں وہ ٹھیک سے بول نہیں پا رہی تھی اور لٹاں تو پہلے ہی اس دکھ سے گزر چکی تھیں۔ اب تو ان کا دل ٹھہر سا گیا تھا۔ اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر بولیں۔

”بیٹا! میں نے تمہیں پہلے ہی بتایا تھا کہ تمہارے تایا ابا کا کچھ زور نہیں چلتا۔ اور تمہاری دادی نے بھی ٹھیک کہا تھا کہ پیسے والا ہو کر بھی غلام ہے۔ پھر تمہیں خود سمجھنا چاہیے کہ برسوں تمہارے ابا میاں بستر مرگ پر پڑے رہے..... کبھی یہ پوچھنے نہیں آئے۔ انہوں نے اگر ہمیں اس کو اثر میں جگہ دے دی ہے تو اسے احسان سمجھو۔“

”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔ احسان ہی تو ہے ان کا۔“ وہ چھوٹے سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کتنی خوش ہوتی ہوگی ابا میاں کی روح.....! ان کے بھائی نے ہمیں سرد و گرم سے بچالیا ہے۔“

”میں اسی لیے تمہیں نہیں بتانا چاہتی تھی کہ تم دل پر لے بیٹھو گی۔“

”نہیں لٹاں! آپ کو پہلے سے بتانا چاہیے تھا یا پھر اب بھی نہ بتائیں۔ پتہ نہیں سب کے سامنے جاتے ہوئے اب مجھے کیسا لگے گا۔ رشنا اور روبی.....“

اس کا نام ہونٹوں تک آتے آتے رہ گیا اور وہ نظریں چرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

لٹاں کچھ دیر تک خاموش رہیں پھر کہنے لگیں۔

”اصل بات تو وہ ہیں رہ گئی۔ جس کے لیے مجھے یہ ساری حقیقت بتانی پڑی۔“

”اور کیا بات ہے۔“ وہ کچھ سہم کر دیکھنے لگی کہ کہیں کوئی ایسا انکشاف جو اس کی قوت برداشت سے بڑھ کر ہو سچ سچ اسے مار ڈالے گا۔ اور اس کی کیفیت بھانپ کر لٹاں نے پہلے اسے اپنے سینے سے لگایا پھر اس کی پیشانی چوم کر بولیں۔

”تم بہت جلدی گھبرا جاتی ہو۔ اب میں تم سے کوئی بات نہیں کہوں گی۔“

کیسے کلثوم اس گھر میں راج کرتی ہے۔ آپ ہامی تو بھریں بوا۔“

”میرے ہامی بھرنے سے کیا ہوگا بیٹا۔ پہلے تم اپنے ماں باپ سے بات کرو۔“

بوانے ابھی بھی وہی بات کی جو اتنے دنوں سے کہہ رہی تھیں۔ تو وہ زوج ہو کر بولا۔

”بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن۔ میرے ماں باپ کبھی راضی نہیں ہوں گے۔“

”دیکھ لو تم خود ہی کہہ رہے ہو کہ وہ کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ پھر میں کیسے اپنی بیٹی تم

سے بیاہ دوں۔“

”افوہ! آپ سمجھ نہیں رہیں۔ میرا مطلب ہے وہ ابھی راضی نہیں ہوں گے لیکن بعد میں

جب انہیں معلوم ہوگا کہ میں کلثوم سے شادی کر چکا ہوں تب اگر وہ ناراض ہوئے بھی تو زیادہ سے

زیادہ ہمیں گھر سے نکال دیں گے۔ اس سے زیادہ تو کچھ نہیں کر سکتے۔“

وہ اتنے دنوں سے انہیں قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب باقاعدہ ان کے پیروں

کے پاس دوزانو بیٹھ گیا اور ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

”بوا! آپ کو میرا یقین نہیں یا آپ مجھے کلثوم کے قابل نہیں سمجھتیں۔“

”کیا بات کر رہے ہو بیٹا۔ کلثوم کے لیے مجھے تم سے اچھا کہاں ملے گا لیکن.....“

”چھوڑیں لیکن ویکن۔ جتنا سوچیں گی اتنی زیادہ پریشان ہوں گی۔ بس آپ تیاری

کریں میں ابھی نکاح کا بندوبست کرتا ہوں۔“

انماں کے کمزور پڑنے پر اس نے مضبوطی سے ان کے ہاتھ تھام لیے اور انہیں بولنے کا

موقع دے بغیر کہنے لگا۔ ”اس سے اچھا موقع پھر نہیں ملے گا۔ سب لوگ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں

اور ان کی واپسی تین چار روز سے پہلے نہیں ہوگی۔ اور بعد کی آپ فکر نہیں کریں۔ سب میری ذمہ

داری ہے۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن.....“ انماں شش و پنج میں تھیں۔

”اوں ہوں.....! پھر وہی لیکن۔ بس آپ چائے پانی کا انتظام کریں۔ میں دو چار

نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔

”رہجہ! اگر کوئی دیکھ لیتا تو.....“

”کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے سب گئے ہوئے ہیں۔“ وہ دونوں ہاتھ

پھیلائے ہوئے یوں بولا جیسے خود کو آزاد محسوس کر رہا ہو۔ پھر بڑھ کر اس کے ہاتھ سے پائپ لے کر

دور پھینک دیا۔ اور اس کی کلائی تھام کر بولا۔

”چھوڑو یہ سب۔ چلو میں تمہیں کہیں باہر لے چلوں۔“

”کیا؟“ اس کی چیخ نکل گئی پھر سنبھل کر بولی۔

”انماں ہرگز اجازت نہیں دیں گی۔“

”پوچھ لیتے ہیں ان سے۔“ وہ بڑی ترنگ میں تھا، اس کی کلائی کھینچتا ہوا چل پڑا۔

”رہجہ.....“ وہ سچ مچ پریشان ہو گئی۔ مسلسل اس کی گرفت سے اپنی کلائی چھڑانے کی

کوشش کرتی رہی لیکن وہ اسی طرح انماں کے سامنے لے آیا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ انماں ان

دونوں کو ساتھ دیکھ رہی تھیں۔ ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ پھر کچھ ناگواری سے بولیں۔

”یہ کیا حرکت ہے میاں؟“

”وہ بوا! یہ باہر جانے کی ضد کر رہی تھی۔ میں نے کہا پہلے آپ سے پوچھ لیتے ہیں۔“

وہ بڑے آرام سے سارا الزام اس کے سر رکھ گیا۔ جھٹکے سے کلائی چھڑا کر بھاگ گئی تو

انماں اسے تنبیہ کیے بغیر نہیں رہ سکیں۔

”میاں! تمہیں خیال کرنا چاہیے۔ ہم غریبوں کے پاس لے دے کے ایک عزت ہی تو

رہ جاتی ہے۔“

”اور کیسے خیال کیا جاتا ہے بوا! میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ نہ غلط کرنا چاہتا ہوں۔ آپ

ہی میری بات نہیں سمجھ رہیں۔“ وہ انہیں کندھوں سے تھام کر بٹھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”آپ کی

عزت کو میں اپنی عزت بنانا چاہتا ہوں۔ ابتداء میں کچھ دشواریاں ضرور ہیں لیکن پھر آپ دیکھیں گے۔

ارمانوں کی رات ہے۔

دوستوں کو لے کر آتا ہوں۔ نیک کام میں دیر کیسی۔

وہ فوراً نوک کر بولا۔ پھر اس کے سامنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر آڑھالینتے ہوئے کہنے لگا۔

”تمہیں اس روپ میں میں نے کب تصور کیا تھا۔ اس روز جب تم وہاں بیٹھی دھیرے دھیرے گنگنا رہی تھیں ذرا پھر گا کر سناؤ تو۔“

”کیا؟“ اسے بالکل یاد نہیں تھا۔ ”میں کب گارہی تھی؟“

”کمال ہے۔ یعنی میں تو اس ایک ادا پہ مر مٹا اور تمہیں خبر ہی نہیں۔ یاد کرو فرح کی

شادی میں..... وہ کیا تھا میں جو ہوتی راجہ.....“

”آپ کو یاد ہے؟“ وہ حیران ہوئی۔

”صرف یاد..... کوئی ایسا دن نہیں گیا جو میں نے اس گیت کے ساتھ تمہیں نہ سوچا ہو

اور اسی حوالے سے میں نے خود کو راجہ کہلوایا۔ پھر بھی تمہیں یاد نہیں۔“

اس کی آنکھوں میں قدیلیں روشن تھیں اور ایسی ہی چمکتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھنے

لگا۔ پھر مسکرا کر بولا۔

”ذرا سا گنگنا دو مجھے اچھا لگے گا۔“

اسے بہت شرم آ رہی تھی لیکن اس کی خواہش رد نہیں کر سکی۔

نجر لاگی تورے بنگلے پر

میں جو ہوتی راجہ توری دلہنیا

منک رہتی راجہ تورے بنگلے پر

”بس راجہ.....!“ شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ ہنس پڑا۔ پھر اس کا ہاتھ

ہونٹوں سے چھو کر بولا۔

”اب تو تم سچ میری دلہن ہو چکی ہو۔ اور ہاں میں تمہیں رونمائی دینا تو بھول ہی گیا۔“

وہ کہتا ہوا کھڑا ہوا اور فوراً پورج کی طرف بڑھ گیا۔ لٹاں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہیں۔ اس کے بعد بھی کتنی دیر وہیں بیٹھی رہیں۔ بیٹھا رخصتوں اندیشوں کے درمیان کہیں اطمینان بھی موجود تھا کہ وہ کوئی غیر نہیں۔ ان کے جیٹھ کا بیٹا تھا اور پھر شادی کر رہا تھا۔ اس کے ماں باپ اب راضی نہیں تو پھر راضی ہو جائیں گے۔ شاید ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ابتداء میں کچھ دشواریاں ہیں پھر تو کلثوم اس گھر پر راج کرے گی۔ انہوں نے دور تک نظریں دوڑائیں پھر کلثوم کو پکارتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

پھولوں کے زیور سے آراستہ اس کے وجود سے پورا کمرہ مہک رہا تھا۔ سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ بار بار پلکیں جھپکتی کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہی۔ اور وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ کتنی دیر تک بنا کوئی آہٹ کیے اسے دیکھتا رہا۔ پھر یونہی بے آواز قدموں سے چلتا ہوا عین اس کی نگاہوں کے سامنے رک کر دلکشی سے مسکرایا تو وہ ہپٹا کر پیشانی گھٹنوں پر ٹکا گئی۔

”ارے.....! کیا میں اتنا خوفناک ہوں۔“ وہ شرارت سے کہتے ہوئے اس کے

سامنے بیٹھ گیا۔ پھر اس کے ہاتھ کو ذرا سا جھٹکا دے کر بولا۔

”اپنے راجہ کو سلام نہیں کرو گی۔ اچھا پہلے میرا سلام ہو۔“

”راجہ.....!“ اس نے ذرا سی پیشانی اونچی کی اور ٹھوڑی گھٹنوں پر رکھتے ہوئے

بولی۔ ”مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”کس سے؟“

”بیگم آئیں گی تو.....“

”کم آن یار! کم از کم آج کی رات ہر فکر و غم سے آزاد ہو جاؤ۔ یہ اندیشوں کی نہیں

جلدی میں یہی خرید سکا ہوں۔“

وہ یاد آنے پر اٹھ بیٹھا اور جیب سے انگٹھی نکال کر اس کی انگلی میں ڈالتے ہوئے بولا۔

”میری محبت کی پہلی نشانی..... گوکہ بہت معمولی سی ہے لیکن.....“

”نہیں راجہ! یہ معمولی نہیں ہے۔“ وہ ٹوک کر بولی۔ ”معمولی تو میں ہوں جسے آپ نے

اپنی محبتوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ کہاں چھپاتی پھروں گی میں اس انمول خزانے کو..... میرا تو دل

بھی اتنا سا ہے۔“

”کتنا سا؟“ اس کی شرارت سے پوچھنے پر جھینپ کر بولی۔

”آپ کو مذاق سو بھر رہا ہے اور مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”میری موجودگی میں بھی ڈر رہی ہو۔ ٹھیک ہے میں تمہاری اتناں کو بلاتا ہوں۔“

”کیا؟“ وہ شٹا کر چیخی اور اسے اٹھتے دیکھ کر بے اختیار اس کا ہاتھ تھا تا تو اگلے پل اس

کے بازوؤں میں تھی۔

صبح اپنی تمام تر عنایتوں سمیت جلوہ افروز ہوئی اور وہ تو ہمیشہ سے جلدی اٹھنے کی عادی

تھی۔ بڑی مشکل سے خود کو اس کے بازوؤں کے حلقے سے نکال پائی۔ پھر احتیاط سے بیڈ پر سے

اُتر کر کھڑکی سے پردے ہٹا کر دیکھنے لگی۔ خوبصورت سے تھا۔ نسیم سحر اس کے چہرے کو چھو کر بالوں

سے اٹھکھیلیاں کرنے لگی۔ ایک پل کو اسے سب گھروالوں کا خیال آیا لیکن یہ جو وقت اس کی

دسترس میں تھا اسے وہ کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے فوراً پلٹ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔ بے خبری

کی نیند سو یا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ کتنی دیر تک وہ چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔ پھر بہت نرمی سے اس

کی پیشانی پر آئے بالوں میں اپنی انگلیاں پھنسا کر پہلے ذرا سا اوپر سمیٹا۔ پھر اچانک جانے کیا ہوا

بلا ارادہ ہی اس کے بالوں کو زور سے مٹھی میں جکڑ لیا۔ تکلیف کے باعث فوراً اس نے آنکھیں کھول

دیں۔ اور بے اختیار اپنے بالوں میں پھنسے اس کے ہاتھ کو پکڑ لیا تو اپنی غیر ارادی حرکت پر وہ شٹا

گئی۔ تب وہ ہنس کر بولا۔

”میرا تو خیال تھا مجھے اٹھانے کے لیے تمہیں سو جتن کرنے پڑیں گے لیکن تم نے ایک

جھٹکے میں اٹھا دیا۔“

”مجھے پتہ تھا۔ آپ آرام سے نہیں اٹھیں گے۔“ اس نے بات بنائی لیکن وہ چھیز کر

بولا۔

”تمہیں کیسے پتہ تھا؟“

”بس پتہ تھا اور اب آپ فوراً اٹھ جائیں۔ میں نیچے جا رہی ہوں۔“ اور وہ اٹھنے لگی کہ

اس نے ہاتھ کھینچ کر دوبارہ بٹھا لیا۔

”نیچے کیا کرنے جا رہی ہو؟“

”ناشتہ بناؤں گی اور اس سے پہلے آپ کے لیے چائے۔“

”ہوں۔“ اس نے کچھ دیر سوچا پھر کہنے لگا۔ ”چائے رہنے دو تم ناشتہ بناؤ۔ میں بھی

ابھی آرہا ہوں۔ پھر ناشتہ کر کے کہیں باہر چلیں گے۔“

”اتناں سے پوچھ لیں۔“

”جناب! اب اتناں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بڑے آرام سے اپنا حق

جتاتے ہوئے اٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔

☆☆☆

اور پھر یہ تین دن تو جیسے پلک جھپکتے میں گزرے تھے۔ صبح سے رات تک وہ اسے جانے

کہاں کہاں لیے پھرتا۔ اپنی پوری زندگی میں اس نے اتنا کچھ نہیں دیکھا تھا جتنا اس نے تین دن

میں اسے دکھا ڈالا تھا۔ کلفٹن، پیراڈائز، پوائنٹ، مختلف پارک، فائبر اسٹار ہوٹلز اور ڈھیروں شاپنگ

کرائی۔ حقیقتاً ایک پل کو بھی اسے کسی اندیشے میں نہیں گھرنے دیا تھا۔ بلکہ اسے تو یوں لگ رہا تھا

جیسے اس کی زندگی میں اب ہمیشہ ہی ایسا موسم رہے گا۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ اپنے راجہ کی ہو چکی

تھی۔ بہر حال ان تین دنوں میں وہ صرف محبتوں کی کلیاں چنتی رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کی

میں مصروف تھیں۔ کم از کم انہیں اس کی کیفیت کا اندازہ ہوگا۔ پھر بھی دن میں کسی وقت آکر جھانکا تک نہیں۔ اس کی پریشانی فطری تھی۔ کھانا پینا تو دور کی بات وہ کسی پل چین سے بیٹھ بھی نہیں سکی۔ ایک پیر کمرے میں تو دوسرا دروازے پر۔ کتنی بار سوچا خود چلی جائے لیکن جانے کیسے کیسے اندیشے راہ میں حائل ہو گئے۔ اور اتناں رات کے تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ہی آئیں۔ اس وقت تک اس کا ضبط جواب دے چکا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی لپک کر ان سے لپٹ گئی اور زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

”ہائیں ہائیں!“ اتناں نے قصداً انجان بن کر ٹوکا۔ ”رو کیوں رہی ہو؟“
 ”خدا کے لیے اتناں! اتنی بے خبر نہ بنیں۔ مجھے بتائیں راجہ کہاں ہے؟ اس نے مجھے بلایا کیوں نہیں؟ میں سارا دن انتظار کرتی رہی۔“ وہ روتے ہوئے روانی سے بولے گئی۔
 ”صبر سے بیٹا! پریشان کیوں ہوتی ہو۔ وہ کہیں دور تو نہیں گیا۔ اسی گھر میں ہے۔“ اتناں نے اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کیے پھر کندھوں سے تھام کر بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”تم نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟“
 ”اتناں راجہ نے بیگم کو بتایا ہے کہ اس نے شادی کر لی ہے؟“ وہ ان کی بات سرے سے نظر انداز کر گئی۔

”اتنی جلدی کیسے بتا سکتا ہے۔ موقع دیکھ کر ہی بات کرے گا۔ چلو تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھوؤ۔ میں تمہارے لیے کھانا.....“

”نہیں اتناں!“ وہ فوراً بولی۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے۔“
 ”بھوک کیسے نہیں ہے۔ صبح سے ایسے ہی بیٹھی ہوئی ہو۔“ اتناں اٹھنے لگی تھیں تبھی دروازے پر بہت ہلکی سی دستک سنائی دی۔ تو وہ چونک کر اسی قدر کہہ سکی۔

”اتناں! یہ تو.....“

کھلکھلاتی ہوئی ہنسی انہی کلیوں کی مرہون منت تھی۔ اس وقت ناشتہ بناتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے گنگنا رہی تھی۔ تبھی وہ شور مچاتا ہوا آ گیا۔

”جلدی کرو بیوی! ایک تو اٹھنے میں دیر ہو گئی۔ اور ابھی تمہیں تیار بھی ہونا ہے۔“
 ”میں کیا کروں۔ دیر آپ نے کی ہے۔ کب سے اٹھا رہی ہوں۔“ وہ ناشتے کے لوازمات وہیں ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

”اچھا بس اب تم دیر نہیں کرنا۔ جلدی سے ناشتہ کرو اور.....“
 اتناں کے آنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ پھر ان سے کہنے لگا۔
 ”آئیں اتناں! ناشتہ کریں۔“
 ”نہیں میاں! میں یہ بتانے آئی ہوں کہ وہ صاحب لوگ آگئے ہیں۔“
 ”کیا؟“ وہ بوکھلایا کہ اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
 جبکہ وہ کچھ گم صم سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ جو ایسے ہی بوکھلائے ہوئے انداز میں اتناں سے پوچھ رہا تھا۔

”کب آئے سب لوگ؟“
 ”میں نے ابھی ٹیکسی میں سے صاحب کو اترتے ہوئے دیکھا ہے۔“
 اتناں کے بتانے پر وہ مزید کچھ کہے بغیر فوراً کچن سے نکل گیا تو وہ بے حد خاموش نظروں سے اتناں کو دیکھنے لگی۔

”تم اپنے کوارٹر میں جاؤ بیٹی! اور جب تک سیف نہ بلائے۔ اس طرف نہیں آنا۔“
 اتناں نظریں چراتے ہوئے بولیں اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کچن سے نکل گئیں تو وہ بے اختیار ان کے پیچھے لپکی لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی اور بوجھل قدموں سے اپنے کوارٹر کا رخ کیا۔

پھر سارا دن وہ انتظار کرتی رہ گئی۔ اس کا بلاوا نہیں آیا۔ اور اتناں پتہ نہیں کن کاموں

میں مصروف تھیں۔ کم از کم انہیں اس کی کیفیت کا اندازہ ہوگا۔ پھر بھی دن میں کسی وقت آکر جھانکا تک نہیں۔ اس کی پریشانی فطری تھی۔ کھانا پینا تو دور کی بات وہ کسی پل چین سے بیٹھ بھی نہیں سکی۔ ایک پیر کمرے میں تو دوسرا دروازے پر۔ کتنی بار سوچا خود چلی جائے لیکن جانے کیسے کیسے اندیشے راہ میں حائل ہو گئے۔ اور اتناں رات کے تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد ہی آئیں۔ اس وقت تک اس کا ضبط جواب دے چکا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی لپک کر ان سے لپٹ گئی اور زار و قطار رونا شروع کر دیا۔

”ہائیں ہائیں!“ اتناں نے قصداً انجان بن کر ٹوکا۔ ”رو کیوں رہی ہو؟“
 ”خدا کے لیے اتناں! اتنی بے خبر نہ بنیں۔ مجھے بتائیں راجہ کہاں ہے؟ اس نے مجھے بلایا کیوں نہیں؟ میں سارا دن انتظار کرتی رہی۔“ وہ روتے ہوئے روانی سے بولے گئی۔
 ”صبر سے بیٹا! پریشان کیوں ہوتی ہو۔ وہ کہیں دور تو نہیں گیا۔ اسی گھر میں ہے۔“ اتناں نے اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو صاف کیے پھر کندھوں سے تھام کر بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

”تم نے کچھ کھایا بھی ہے یا نہیں؟“
 ”اتناں راجہ نے بیگم کو بتایا ہے کہ اس نے شادی کر لی ہے؟“ وہ ان کی بات سرے سے نظر انداز کر گئی۔

”اتنی جلدی کیسے بتا سکتا ہے۔ موقع دیکھ کر ہی بات کرے گا۔ چلو تم اٹھ کر منہ ہاتھ دھوؤ۔ میں تمہارے لیے کھانا.....“

”نہیں اتناں!“ وہ فوراً بولی۔ ”مجھے بھوک نہیں ہے۔“
 ”بھوک کیسے نہیں ہے۔ صبح سے ایسے ہی بیٹھی ہوئی ہو۔“ اتناں اٹھنے لگی تھیں تبھی دروازے پر بہت ہلکی سی دستک سنائی دی۔ تو وہ چونک کر اسی قدر کہہ سکی۔

”اتناں! یہ تو.....“

کھلکھلاتی ہوئی ہنسی انہی کلیوں کی مرہون منت تھی۔ اس وقت ناشتہ بناتے ہوئے وہ دھیرے دھیرے گنگنارہی تھی۔ تبھی وہ شور مچاتا ہوا آ گیا۔

”جلدی کرو بیوی! ایک تو اٹھنے میں دیر ہوگئی۔ اور ابھی تمہیں تیار بھی ہونا ہے۔“
 ”میں کیا کروں۔ دیر آپ نے کی ہے۔ کب سے اٹھا رہی ہوں۔“ وہ ناشتے کے لوازمات وہیں ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

”اچھا بس اب تم دیر نہیں کرنا۔ جلدی سے ناشتہ کرو اور.....“
 اتناں کے آنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ پھر ان سے کہنے لگا۔
 ”آئیں اتناں! ناشتہ کریں۔“
 ”نہیں میاں! میں یہ بتانے آئی ہوں کہ وہ صاحب لوگ آگئے ہیں۔“
 ”کیا؟“ وہ بوکھلایا کہ اپنی جگہ سے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
 جبکہ وہ کچھ گم صم سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ جو ایسے ہی بوکھلائے ہوئے انداز میں اتناں سے پوچھ رہا تھا۔

”کب آئے سب لوگ؟“
 ”میں نے ابھی ٹیکسی میں سے صاحب کو اترتے ہوئے دیکھا ہے۔“
 اتناں کے بتانے پر وہ مزید کچھ کہے بغیر فوراً کچن سے نکل گیا تو وہ بے حد خاموش نظروں سے اتناں کو دیکھنے لگی۔

”تم اپنے کوارٹر میں جاؤ بیٹی! اور جب تک سیف نہ بلائے۔ اس طرف نہیں آنا۔“
 اتناں نظریں چراتے ہوئے بولیں اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کچن سے نکل گئیں تو وہ بے اختیار ان کے پیچھے لپکی لیکن پھر کچھ سوچ کر رک گئی اور بوجھل قدموں سے اپنے کوارٹر کا رخ کیا۔

پھر سارا دن وہ انتظار کرتی رہ گئی۔ اس کا بلاوا نہیں آیا۔ اور اتناں پتہ نہیں کن کاموں

نے اتنی پتیتوں میں اترنے کا سوچا کیسے؟“

”رلجہ!“ وہ انتہائی دکھتاسف سے ڈھے گئی اور اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کہے گیا۔
 ”اسی لیے میں نے تمہاری لتاں کو پہلے بتا دیا تھا کہ ابتداء میں کچھ دشواریاں ہوں گی۔
 ماما کو منانے میں وقت لگے گا۔ اب یہ تو نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارا ہاتھ تھام کر ان کے سامنے جا کھڑا
 ہوں اور کہوں کہ میں نے تم سے شادی کر لی ہے۔“

اس کا مقصد دامن بچانا یا چھڑانا نہیں تھا بلکہ حقیقت سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن
 اس میں مزید سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ بمشکل خود کو سہارا دے کر کھڑی ہوئی اور اس کے متوجہ ہونے
 سے پہلے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا اور ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے
 لگی۔

”کٹھوم!“ اس نے دروازے پر ہاتھ مار کر پکارا تو وہ آواز دبا کر چیخی۔

”چلے جاؤ رلجہ! مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔“

پھر بھاگ کر لتاں پر آن گری تو وہ نیند میں سے ہڑبڑا کر اٹھیں اور اسے روتے دیکھ کر
 پریشان ہو گئیں۔

”کیا ہوا ہے؟“ اور وہ اسی شدت سے روتے ہوئے چل کر بولی۔

”میں یہاں نہیں رہوں گی لتاں! بس مجھے اپنے گھر لے چلیں۔“

”اب تو یہی تمہارا گھر ہے۔“ لتاں نے اس کے چہرے پر آئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے
 کہا تو وہ چیخ پڑی۔

”مت بہلائیں مجھے..... یہ کبھی میرا گھر نہیں ہو سکتا۔“

”صبر سے بیٹا۔“

”ساری زندگی صبر شکر کرتی رہیں آپ، کیا ملا آپ کو؟ مجھے بھی کچھ نہیں ملے گا۔ اور اس

سے پہلے کہ یہاں سے دھکے دے کر نکالے جائیں، اپنے گھر چلیں۔“

کے آنسو رومال میں جذب کرتے ہوئے بولا۔

”رونا تو جیسے میرے مقدر میں لکھا ہے۔“

”اس وقت پوچھوں گا تم سے، جب اسی آنگن میں تمہارے قہقہے گونجا کریں گے۔“

”پتہ نہیں وہ وقت میری زندگی میں آئے گا بھی یا نہیں۔“

”کم آن یار! مایوسی کی باتیں مت کرو۔ اچھا دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔“

وہ اس کا دھیان بنانے کی خاطر جیسیں ٹٹولنے لگا۔ پھر اسے دیکھ کر ذرا سے کندھے اچکا

کر بولا۔ ”شاید کمرے میں بھول آیا ہوں۔ ابھی لا دوں؟“

”نہیں، مجھے نہیں چاہیے۔“ وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولی۔

”ٹھیک ہے جب چاہیے ہو خود ہی آکر لے لینا۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تو وہ اس

کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”آپ بہت سنگدل ہیں۔ پتہ نہیں کون سے جنم کا بدلہ لے رہے ہیں مجھ سے۔“

”نادانی کی باتیں مت کرو کٹھوم! میرا خیال تھا تم میرا ساتھ دو گی، میری مجبوری کو سمجھو گی

لیکن تم اُلٹا مجھے پریشان کر رہی ہو۔“ اس کے بگڑنے پر وہ سنائے میں آ کر بولی۔

”میں پریشان کر رہی ہوں؟“

”اور کیا۔ آخر جلدی کس بات کی ہے۔ میں تم سے بہت دور تو نہیں چلا گیا۔ یہیں رہتا

ہوں۔ روزانہ تمہارے پاس آتا ہوں۔ فی الحال اس کو بہت سمجھ لو۔“ قدرے توقف کے بعد کہنے

لگا۔

”تم ماما کو نہیں جانتیں، انہیں اپنے اسٹیشن کا بہت خیال اور بہت زعم ہے۔ ہمیشہ اپنے

سے اونچے لوگوں کو دیکھتی ہیں۔ اگر مجھے ایک فیصد بھی ان کے مان جانے کا یقین ہوتا تو میں تم سے

اس طرح شادی کیوں کرتا۔ پہلے انہیں مناتا۔ لیکن مجھے پتہ ہے وہ کبھی نہیں مانیں گی۔ جس روز

میری زبان پر تمہارا نام آیا تو وہ تمہارا حشر تو بعد میں خراب کریں گی پہلے مجھ سے پوچھیں گی کہ میں

”پتہ تو چلے۔ بات کیا ہوئی۔ سیف نے کچھ کہا ہے؟“ لتاں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھایا تو وہ انکی گود میں سر رکھ کر اور شدت سے رونے لگی۔ ساتھ ہی ایک جملے کی تکرار کیے جا رہی تھی۔

”بس لتاں! یہاں سے چلیں۔ یہاں میں مر جاؤں گی۔“

لتاں آہستہ آہستہ اس کا سر تھپکنے لگیں۔ کتنی دیر بعد جب اس کی سسکیاں تھم گئیں تب اس کا دل رکھنے کی خاطر بولیں۔

”چلیں گے بیٹا! میں سیف سے بات کر لوں۔“

”اس سے کیا بات کریں گی۔“ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”بات کیا کرنی ہے۔ بس اسے بتا دوں گی کہ ہم جا رہے ہیں۔“

”کوئی ضرورت نہیں اسے بتانے کی۔ بس ہم صبح ہی چلے جائیں گے۔“

اس نے کبھی لتاں سے اس طرح ضد نہیں کی تھی۔ جب ہی وہ حیران ہوئیں۔ پھر زری

سے بولیں۔

”صبح کیسے جاسکتے ہیں آگے گھر خالی تھوڑی پڑا ہے۔“

وہ کہتے ہوئے اپنی جگہ پر آ کر لیٹ گئی تو لتاں نے سوچا۔ وقتی غصہ ہے صبح تک ٹھیک ہو جائے گی۔ لیکن زندگی میں پہلی بار وہ خود سے کوئی فیصلہ کر کے اس پر اٹل ہو چکی تھی۔ جیسی صبح آنکھ کھلنے پر لتاں کو موجود نہیں پایا تو اسی وقت ان کے پیچھے چلی آئی۔

”چھوڑیں لتاں آپ..... میں کر لوں گی سب۔ بس آپ جا کر اپنا گھر خالی

کروائیں۔“

”پاگل ہوئی ہو کیا؟“ لتاں کو بھی غصہ آ گیا۔

”آپ چاہتی ہیں میں پاگل ہو جاؤں۔ لوگ پتھر ماریں مجھے..... تو یہاں رہ کر یہ

بہت جلد ممکن ہے۔“

وہ ہتھ سے اُکھڑی کچھ سننے کی روادار نظر نہیں آرہی تھی۔ مجبوراً لتاں کو ہتھیا رڈالنے پڑے۔

”اچھا دیکھو تم جا کر آرام کرو۔ میں کام سے فارغ ہو کر چلی جاؤں گی۔“

”نہیں! اب آپ کوئی کام نہیں کریں گی۔“

اس نے لتاں کو کندھوں سے تھام کر چولہے کے پاس سے بٹایا تھا کہ بیگم آ گئیں۔ پہلے لتاں کو ناشتہ جلدی بنانے کو کہا پھر اسے دیکھ کر بولیں۔

”تم کہاں ہوتی ہو کلثوم؟ نظر نہیں آتیں اور یہ تم اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو؟“

”بس بیگم! اس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔“

”طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ اپنے آپ تو ٹھیک نہیں ہو جائے گی۔“

بیگم نخوت بھرے انداز میں کہتے ہوئے چلی گئیں۔ تو وہ لتاں کو کچن سے بھیج کر خود ناشتہ بنانے میں لگ گئی۔

ایک تو پہلے ہی طبیعت ٹھیک نہیں تھی دوسرے چولہے کے پاس کھڑے رہنے سے اس کا سینہ جلنے اور سر چکرانے لگا۔ جلدی کرنے کی کوشش میں اور دیر ہو گئی۔ سب ٹیبل پر پہنچ گئے اور بیگم نے وہیں سے پکارنا شروع کر دیا تو وہ جو کچھ تیار تھا۔ ٹرے میں رکھ کر ڈائننگ روم میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور شاید یہ اس بندھن کا اعجاز تھا کہ اتنی احتیاطوں کے باوجود اس سے ایک غیر اختیاری حرکت سرزد ہو گئی کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ہاتھوں سے ٹرے تھام لی اور وہ فوراً ہی واپس پلٹ گئی۔ جبکہ وہ احساس ہونے پر مزید بوکھلا گیا اور بیگم کے ٹوکنے سے پہلے جھنجھلا کر بولا۔

”ممانجھے دیر ہو رہی ہے۔“

”دیر ہو رہی ہے۔“ بیگم نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا تبھی وہ چائے لے کر آ گئی تو بیگم کی چبھتی ہوئی نظریں اس پر جا ٹھہریں اور انتہا کی ناگواری سے پوچھا۔

”تمہاری ماں کہاں ہے؟“ وہ جواب دینا چاہتی تھی لیکن سر بہت زور سے چکرایا اور

ہو تم؟

”ٹھیک کہہ رہی ہوں اور آپ مجھے نہیں روکیں گی۔“ وہ اپنی بات کہہ کر اماں کے پاس سے ہٹ گئی۔

پھر اماں نے اس کی منتیں کر ڈالیں کہ ابھی وہ صبر سے کام لے۔ یہاں سے جانے کے بعد کسی دن وہ خود آکر صاحب سے بات کریں گی۔ انہیں بتائیں گی کہ سیف اس سے شادی کر چکا ہے۔ ساتھ ہی اسے یقین دلاتیں کہ اس معاملے میں صاحب ہرگز خاموش نہیں رہ سکیں گے۔ اگر بیگم کو رام نہ کر سکے تب بھی کوئی دوسرا راستہ ضرور نکالیں گے۔ اور وہ خاموشی سے اماں کی تسلیاں سنتی رہی۔ ان پر یہی ظاہر کیا کہ ان سے متفق ہو گئی ہے۔ لیکن اپنے طور پر جو سوچ چکی تھی اس پر عمل کرنے کا پورا ارادہ رکھتی تھی۔

اس روز چھٹی کے باعث سب گھر پر تھے۔ اور خصوصاً ایسے دنوں میں تو وہ کونھی کی طرف جاتی بھی نہیں تھی۔ لیکن اس وقت ایسی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ غالباً وہی انتشار کے باعث..... کہ وہ کچھ دیر کے لیے رشنا کے پاس چلی آئی۔ اس گھر میں ایک وہی تھی جو اس سے ٹھیک طرح سے بات کر لیتی تھی۔

”کیا بات ہے تم اتنی بے زار کیوں رہ رہے ہو؟“ اس وقت اس کے تھکے تھکے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے رشنا نے پوچھ لیا۔

”پتہ نہیں میں ایسی کیوں ہو گئی ہوں میرا کسی بات میں دل نہیں لگتا۔“

وہ اپنی کیفیت جانتی تھی اور نہیں بھی..... اصل میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اپنی بے زاری کو کس سے منسوب کرے۔

”اس لیے کہتی ہوں کچھ کر لو! اپنی زندگی بنا لو۔“ رشنا کوئی موقع نہیں جانے دیتی تھی۔ اور وہ گہری سانس کھینچ کر بولی۔

”ہاں اب تو واقعی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ زندگی بنانے کے لیے نہیں تو گزارنے کے

لیے تو کرنا ہی ہے۔“

”بیوقوف پہلے بناؤ پھر گزارو اپنی مرضی سے۔“

”اپنی مرضی سے۔“ وہ دکھ سے ذرا سانس لی۔

”ایسی باتیں تو آپ ہی لوگ سوچ سکتے ہیں بی بی۔“

”تم کیوں نہیں سوچ سکتیں۔“ رشنا کی جرح سے وہ اکتا کر بولی۔

”چھوڑیں بی بی! کوئی اور بات کریں؟“ پھر خود ہی موضوع بدلتے ہوئے کہنے

لگی۔ ”آپ اپنے گھر والوں سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں سے جانے کے بعد مجھے آپ سب سے زیادہ یاد آئیں گی۔“

”کیا مطلب..... کہاں جا رہی ہو تم؟“

”اپنے گھر۔“

”اپنے گھر.....؟“ رشنا نے چونک کر دیکھا۔ پھر سمجھ کر خوشدلی سے بولی۔ ”اچھا اچھا

میں سمجھ گئی، یعنی بوا تمہاری شادی کر رہی ہیں۔“

”جی.....!“ وہ قدرے شینٹائی پھر سنہل کر بولی۔

”نہیں اماں اور میں یہاں سے جا رہے ہیں۔“

”کیوں کیا ممانے.....؟“

”نہیں بیگم نے جانے کے لیے نہیں کہا، بس ہم خود ہی جا رہے ہیں۔“ وہ اس کی بات

پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑی۔

”اچھا، لیکن سنو میری شادی کے بعد جانا۔“ رشنا نے مروٹا اسے اپنی شادی تک رکھنے

کے لیے کہا تو وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”آپ کی شادی ہو رہی ہے.....؟ کب.....؟“

”بس آجکل میں سیف بھائی کی شادی کی بات پکی ہو جائے گی اس کے بعد شادی کی

تاریخ طے ہو جائے گی۔ میرا مطلب ہے دونوں کی ساتھ۔“
رشنا نے جیسے دھماکہ کر دیا۔ وہ گم صم اسے دیکھے گی۔

”ٹھیک ہے ناں؟“ اس کی کیفیت سے بے خبر رشنا اپنی کہہ رہی تھی۔ ”کوئی زیادہ دور کی بات نہیں ہے میرے خیال میں اگلے مہینے کی کوئی تاریخ مقرر ہو جائے گی۔ کیونکہ میرے سسرال والے بہت جلدی چارے ہیں۔“

”اور سیف..... میرا مطلب ہے چھوٹے صاحب کی کہاں.....؟“ اسے اپنی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔

”مما کے جاننے والے ہیں ان کی بیٹی شائلہ۔ میرے ساتھ پڑھتی تھی۔ بہت خوبصورت ہے اور بہت امیر بھی۔“

آخری بات پر رشنا خود ہی ہنسی اور اسے لگا جیسے ہر شے اس پر ہنسے گی ہو۔ بے اختیار دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے اور اندر اٹھتے ہوئے جوار بھائے کو بے شکل دبا کر بولی۔
”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”کیا..... کیا کیسے ہو سکتا ہے؟“ رشنا بالکل نہیں سمجھی۔ پھر اس روز زرد پڑتے چہرے کو دیکھ کر تشویش سے بولی۔ ”کیا ہوا ہے کلثوم! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ آؤ یہاں لیٹ جاؤ۔“
”نہیں۔“

وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی اور اس سے پہلے کہ رشنا کچھ سمجھتی وہ اس کے کمرے سے نکل آئی۔ اس کے اندر محشر پر پا ہو چکا تھا اور وہ کسی طرح خود پر قابو نہیں رکھ پا رہی تھی۔ اتناں کو ڈھونڈتے ہوئے پہلے کچن پھر کوارٹر میں آئی۔ وہ وہاں بھی نہیں تھیں اور اسے فوری سہارا چاہیے تھا۔
الٹے پیروں واپس آئی اور بیگم کے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ سیڑھیاں اترتے سیف کو دیکھ کر بلا ارادہ وہیں رک گئی اور وہ جانے کس موڈ میں تھا پہلے آس پاس نظریں دوڑائیں اور کسی کو موجود نہ پا کر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ تو وہ جو بلا ارادہ رکھی تھی اس کے مسکرانے پر بری

طرح سلگ کر جم کر کھڑی ہو گئی اور اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگی جیسے ہی اس نے آخری سیڑھی پر پاؤں رکھا وہ اس پر جھپٹ پڑی۔

”راجہ! تم مجھے اتنا بڑا دھوکہ نہیں دے سکتے..... کیا سمجھا تھا تم نے مجھے کہ بہت خاموشی سے تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گی۔ اس کے بعد تم آزاد ہو گے۔“

”یہ کیا بیہودگی ہے چھوڑو مجھے۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟“ وہ بری طرح بوکھلا کر اس کے ہاتھوں سے اپنا گریبان چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ساتھ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ کوئی آ نہ جائے اور وہ واقعی پاگل ہو گئی تھی۔ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

”ہاں! میں پاگل ہو گئی ہوں لیکن میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔“

اس کے چیخنے پر بیگم اور صاحب اپنے کمرے سے نکل آئے۔ ادھر سے رشنا رولی اور اتناں ڈائمنگ روم سے گھبرا کر نکلیں تو لیکن سامنے کا منظر دیکھ کر ٹھٹھک کر وہیں رک گئیں۔
”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ بیگم نے چلا کر اسے خبردار کیا۔ لیکن وہ انہی کے انداز میں چیخ کر بولی۔

”آپ خاموش رہیں بیگم! یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔“
”کیا.....؟“ بیگم ایک دم آپے سے باہر ہو گئیں۔

”کیا معاملہ ہے تم بتاؤ سیف! یہ دو ٹکے کی چھو کری تمہارے مقابل کیسے آئی؟“
”یہ بزدل کیا بتائے گا۔ مجھ سے پوچھیں۔“ وہ زور سے اسے دھکا دے کر بیگم کے مقابل آکھڑی ہوئی۔ اور سینے پر ہاتھ مار کر بولی۔ اس دو ٹکے کی چھو کری سے آپ کا بیٹا شادی کر چکا ہے۔ میں ماں بننے والی ہوں اس کے بچے کی۔ پوچھ لیں اس سے۔“
”شٹ اپ!“ بیگم نے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ ”میں تم جیسی آوارہ لڑکیوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ جانے کس کا گناہ لیے پھرتی ہو؟“

”اگر یہ گناہ ہے تو بھی آپ کے بیٹے کا ہے۔“ وہ اپنے گال پر ہاتھ رکھ کر رندھی ہوئی

بولی۔

”میں تو جا رہی ہوں بیگم! لیکن مت بھولے گا کہ آپ بھی بیٹیاں رکھتی ہیں۔“
”تم بچ ذات.....!“ بیگم اس پر جھپٹنا چاہتی تھیں لیکن اس سے پہلے ہی صاحب نے
ان کے کندھوں کو مضبوطی سے تھام لیا اور وہ چیخ کر بولی۔

”یہ گالی آپ نے مجھے نہیں دی اپنی اولاد کو دی ہے۔“
”کلتھوم.....!“ انہاں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ غالباً سمجھ گئی تھیں کہ
وہ مزید بچ اگلنے والی ہے اور صاحب بھی سمجھ کر انہاں کو اشارہ کرتے ہوئے بولے۔
”جاؤ بوا! لے جاؤ اسے۔“ اس نے تاسف سے اس شخص کو دیکھا جو بڑا آدمی بننے کے
شوق میں رشتوں کی پہچان کو کھو بیٹھا تھا۔ پھر بھی بڑا ابن نہیں سکا تھا۔

☆☆☆

وہی گھر تھا جس کے در و دیوار تابا میاں کے رخصت ہوتے ہی کمزور پڑ گئے تھے۔ ابھی
بھی ان میں اتنا دم خم نہیں تھا لیکن اب وہ مضبوط ہو چکی تھی۔ یا شاید پہلے جس بات کا خوف تھا وہ
اب نہیں رہا تھا۔ کس طرح انہاں اسے چھپا چھپا کر رکھتی تھیں۔ اس نے آتے ہی خود ہی اپنے سر
سے چادر کھینچ لی۔

”مجھے زندہ رہنا ہے انہاں! اور اب میں گھٹ گھٹ کر ڈر ڈر کر نہیں جیوں گی۔“ انہاں
نے ایک پل کو حیران ہو کر اسے دیکھا۔ پھر اپنا برقع سنبھالتے ہوئے اندر چلی گئی تھیں۔

اس رات کھانا کھاتے ہی انہاں اپنے بستر میں جا گھسیں۔ اور وہ آرام سے کام میں لگ
گئی۔ جو سامان اسٹور میں بند کیا تھا اسے نکال نکال کر دوبارہ اسی ترتیب سے رکھنے لگی۔ ایک بار
انہاں نے سرسری انداز میں ٹوکا کہ صبح کر لیں گے پھر انہوں نے بالکل خاموشی اختیار کر لی۔ وہ یہی
سمجھی کہ سو گئی ہیں لیکن کتنی دیر بعد جب فارغ ہو کر آئی تو انہیں جاگتے دیکھ کر حیران ہو گئی۔

”میں تو سمجھی آپ سو گئیں۔“

آواز میں بولی۔

”خبردار! زبان کھینچ لوں گی تمہاری! اگر دوبارہ میرے بیٹے کا نام لیا۔ کوئی معیار ہے
اس کا۔ گناہ بھی کرے گا تو.....“

”بیگم.....!“ صاحب نے پہلی بار لب کشائی کی۔ دبے دبے لہجے میں ٹوکتے ہوئے
بولے۔ ”کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“ بیگم نے تنفر سے گردن اکڑائی۔ ”اتنے بڑے بڑے گھروں
کی لڑکیاں سیف کے آگے پیچھے پھرتی ہیں ان کی طرف تو کبھی دیکھا نہیں اس نے۔ اس نوکرانی کو
لفٹ کرائے گا ہونہہ.....!“

”میں جھوٹ نہیں بول رہی بیگم! آپ سیف سے تو پوچھیں۔“

اس نے پلٹ کر اسے مدد کے لیے بلانا چاہا لیکن وہ بزدل غائب ہو چکا تھا۔ تب وہ
ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو پڑی۔

”دیکھا اس کی مکاری..... میں ابھی اسے پولیس کے حوالے کر دوں گی۔ کہاں ہے
اس کی ماں؟“

اس کے رونے پر بیگم پر الٹا اثر ہوا۔ یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ وہاں سے
کیوں غائب ہو گیا ہے۔ اس پر چلاتے ہوئے اس کی ماں کو آوازیں دیں۔ تو انہاں دھیرے
دھیرے آگے بڑھ کر آئیں اور مری ہوئی آواز میں بولیں۔

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہے بیگم! سیف میاں نے.....“

”بس بڑی بی! اس سے آگے ایک لفظ نہیں کہنا۔“ بیگم نے فوراً ٹوک دیا۔ پھر دھمکی
آمیز لہجے میں کہنے لگیں۔ ”اگر سلامتی چاہتی ہو تو اسی وقت بیٹی کو لے کر میری نظروں سے دور ہو
جاؤ ورنہ.....“

”ورنہ.....“ اس کی ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑیں اور بیگم کو دیکھا۔ پھر ہر خند لہجے میں

”نیند کہاں آتی ہے۔“ لٹاں نے گہری آہ کھینچی۔ پھر ایک نظر اس پر ڈال کر کہنے لگیں۔ ”تم بھی کیا سوچتی ہوگی میں نے تمہیں کس اندھے کنویں میں دھکیل دیا۔“

”نہیں“ میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔“ اس نے قصد اُبے زاری کا مظاہرہ کیا اور تکیہ سیدھا کر کے لیٹ گئی۔ تو قدرے توقف سے لٹاں غالباً اپنی صفائی پیش کرنے لگیں۔

”خدا گواہ ہے“ میں نے ایسا نہیں سوچا تھا، جتنی میری اوقات تھی۔ اس حساب سے صاحب سے کہا تھا کہ رشتہ دیکھ کر تمہارے ہاتھ پیلے کر دیں۔ مجھے کیا معلوم تھا سچ میں یوں سیف میاں آجائیں گے۔ اور مجھ بد نصیب کو اگر ذرا بھی عقل ہوتی تو اپنی بات پر اڑ جاتی کہ پہلے اپنے ماں باپ کو مناؤ۔ لیکن مجھے اس کی منتوں نے عاجز کر ڈالا تھا۔ پھر میں نے سوچا کوئی غیر تو ہے نہیں۔ اپنا ہی بچہ ہے کچھ بھی ہو جائے تمہیں گھر سے تو نہیں نکالے گا۔ مجھ بوڑھی کا کیا بھروسہ اور میرے بعد لے دے کے وہی تمہارے اپنے رہ جاتے ہیں۔ لیکن ہائے ری قسمت جب اپنے ملتے ہیں دکھوں میں اضافہ ہی کر جاتے ہیں۔“

”بس کریں لٹاں! میں نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔ اور وہ اتنا بے انصاف نہیں ہے کہ مجھے کانٹوں پر گھسیٹنے والوں پر ہمیشہ ابر رحمت برساتا رہے۔“ وہ کہتے ہوئے کروٹ بدل گئی۔

پھر اگلے روز سے ہی لٹاں نے مشین سنبھال لی۔ قریبی کارخانے سے خود جا کر سلائی کا مال لے آئیں۔ وہ پہلے گھر کا کام نمٹاتی پھر زبردستی لٹاں کو ہٹا کر ان کی جگہ بیٹھ جاتی۔ آس پڑوس کی خواتین خاص طور سے یہ جاننے کے لیے آتی تھیں کہ وہ دوبارہ یہاں کیوں آگئی ہیں۔ جبکہ اس کی شادی ہو چکی تھی اور لٹاں سب کو یہی بتا رہی تھیں کہ اس کا میاں باہر چلا گیا ہے۔ ساس کا سلوک اچھا نہیں تھا۔ اس لیے اسے اپنے ساتھ لے آئی ہیں۔ اور بظاہر تو خواتین اس سے ہمدردی جتاتیں۔ صبر سے رہنے کو کہتیں لیکن اپنے گھروں میں جا کر جانے کیسی کیسی باتیں کرتی تھیں کہ چند دنوں بعد ہی دوبارہ سے سامنے کی بیٹھک جتنے لگی۔ اونچی آواز میں گانے، فحش کلامی اور اب وہ کیوں ڈرتی، پہلے روز ہی دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئی۔

”کیوں بھیا! تمہارے گھر میں ماں بہنیں نہیں ہیں۔ جا کر انہیں سناؤ گانے، بہت خوش ہوں گی۔“

”کھٹوم!“ لٹاں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا، اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولیں۔ ”خوب نام روشن کر رہی ہو باپ کا۔“

”باپ کا نہیں، سر کا۔“ وہ بے حد تنگی سے گویا ہوئی۔ ”میں اب صرف آپ کی بیٹی نہیں ہوں لٹاں! سیٹھ نصیر الدین کی بہو بھی ہوں۔ بڑا زعم ہے ان کی بیگم کو اپنے اسٹیشن کا۔ اور ان کا بیٹا کبھی پستیوں میں اترنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہونہہ..... اسی بیٹے کی اولاد انہی پستیوں میں جنم لے گی۔ اور یہیں پروان چڑھے گی۔ میں دیکھتی ہوں وہ کب تک اس حقیقت سے انکار کریں گی وہ اور ان کا بزدل بیٹا۔“

”تو اپنے ہوش میں نہیں ہے بیٹی۔“

”ہوش تو اس نے بھلائے تھے لٹاں! اب تو سچ مچ ہوش میں آئی ہوں۔“ لٹاں کا چہرہ دیکھ کر وہ ہنس پڑی۔

☆☆☆

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ لٹاں کے سامنے وہ خود کو نارمل پوز کرتی تھی۔ لیکن اس کے اندر جو زخم لگا تھا اس سے ہر پل ٹیسیں اٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔ اور وہ کسی طرح سیف کو معاف کرنے پر تیار نہیں تھی۔ کسی کسی وقت اس کے سنگ گزرے کسی خوبصورت لمحے کا خیال آتا بھی تو وہ فوراً سر جھٹک دیتی۔ وہ ہر گز اسے سوچنا نہیں چاہتی تھی جو محبتوں کا فریب دے کر اس کی زندگی سے کھیل گیا تھا۔ اور المیہ تو یہ تھا کہ وہ اسے خواب سمجھ کر بھلا بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی نشانی اپنے وجود میں لیے پھرتی تھی۔ اور جس روز اس نے بیٹے کو جنم دیا۔ اس روز وہ کسی طرح اس کے خیال سے پیچھا نہیں چھڑاسکی۔ شاید اس لیے کہ بچہ سارے نقش باپ کے چرا لایا تھا۔ وہ جب اس پر نظر ڈالتی اسی ستم گر کا خیال آتا۔ شام سے پہلے وہ جانے کس آس میں گھر کر لٹاں سے کہنے لگی۔

”اتناں! راجہ کو معلوم تو ہو کہ اس کا بیٹا ہوا ہے۔“ اتناں نے چونک کر اسے دیکھا، پھر پر سوچ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولیں۔

”ہاں، معلوم تو ہوا ہے شاید اسی بہانے ہی..... لیکن کون بتائے اسے؟“

”آپ چلی جائیں ناں۔“

”میں.....؟“

”ہاں اتناں! اور کون ہے؟“

اور اتناں تو یہی چاہتی تھیں کہ کسی طرح وہ اپنے گھر میں بس جائے اس کی خاطر وہ جیٹھ جھٹانی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر التجا بھی کر سکتی تھیں..... اور دو ایک بار انہوں نے اس سے کہا بھی تھا کہ اب ان کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔ لہذا وہ جا کر انہیں صحیح صورتحال بتائیں گی لیکن وہ نہیں مانی تھی۔ اور اب وہ خود جانے کو کہہ رہی تھی تو انہوں نے زیادہ پس و پیش نہیں کی۔ اسی وقت پڑوس میں سے زاہدہ کو بلا کر اس کے پاس بٹھایا اور برقعہ سنبھالتے ہوئے نکل گئیں۔

”کہاں جا رہی ہیں تمہاری اتناں؟“ زاہدہ انہیں اتنی عجلت میں نکلتے دیکھ کر اس سے پوچھنے لگی۔

”میرے سرال دادا دادی کو پوتے کی خوشخبری سنانے گئی ہیں۔“ اس کے لہجے میں چھپے طنز کو زاہدہ محسوس کرتی۔ النامتجس ہو کر بولی۔

”پھر تو تمہارے ساس سرابھی بھاگے آئیں گے۔“

”نہیں۔ وہ کچھ دوسرے قسم کے لوگ ہیں۔ رشتے ناتے ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔“

”پھر تو تمہیں اطلاع بھی نہیں بھجوانی چاہیے تھی۔“

”میں نے اپنا فرض سمجھا۔ آگے ان کی مرضی۔ خوش ہوں یا نا خوش..... مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔“

وہ بہت سوچ کر جواب دے رہی تھی کیونکہ اتناں نے جو کہانی سنائی تھی وہ بھی اس سے متفق تھی کہ اس کامیاں باہر گیا ہوا ہے۔ ساس سر کا سلوک ٹھیک نہیں وغیرہ وغیرہ۔

”تمہارا میاں تو خوش ہو گا ناں؟“

”ہاں..... ہاں۔ وہ کیوں نہیں خوش ہوگا۔ میں ذرا چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں، پھر اسے خط لکھوں گی۔“ وہ نظریں چرا کر بولی۔

اور گردن موڑ کر بچے کو دیکھنے لگی۔ تو دھیان آپ ہی آپ اس گھر کی طرف چلا گیا۔

”جانے اتناں کے ساتھ وہ کیا سلوک کریں گے۔“ اس نے سوچا۔ پھر فوراً سر جھٹک کر زاہدہ کو دیکھ کر بولی۔

”پتہ نہیں اتناں نے میرے لیے کچھ پکایا بھی ہے یا نہیں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

”میں دیکھتی ہوں۔“

زاہدہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس کے لیے حلوہ گرم کر کے لے آئی تو وہ تیکے کے سہارے ذرا سی اونچی ہو گئی۔ پھر اس نے اپنا دھیان بٹانے کی خاطر زاہدہ سے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ درمیان میں ایک لمحہ کے لیے بھی خاموشی چھاتی تو وہ فوراً دروازے کی طرف دیکھنے لگتی۔ لاشعوری طور پر شدت سے اتناں کی منتظر تھی اور شاید دل خوش فہم کو کچھ امید تھی کہ اس کے لیے نہ سہی بچے کی خاطر ہی شاید وہ خود میں اتنی جرات پیدا کر لے کہ سونے چاندی کی دیواروں کو ٹھوکر مارتا ہوا چلا آئے۔

جب شام ڈھل چکی تھی تب اتناں واپس آئیں اور گو کہ ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ بہت کچھ سمجھ گئی۔ پھر بھی کتنی دیر تک ان کے پیچھے دیکھتی رہی۔

”کیا ہوا خالہ! اس کی ساس آئیں نہیں؟“ زاہدہ نے اتناں سے پوچھا تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

”نہیں۔“ اتناں مختصر جواب دے کر برقعہ تہ کرتے ہوئے اسٹور میں چلی گئیں۔ پھر

سناٹوں سے نکل کر بولی۔

”نہیں امان! خدا ان پر مہربان نہیں ہوتا۔ رسی دراز کرتا ہے، جب کھینچے گا تو سارا زمانہ دیکھے گا۔“

”سب دل بہلاوے کی باتیں ہیں۔“

امان حد درجہ مایوس تھیں۔ اور وہ اب مایوسیوں سے نکل رہی تھی کیونکہ پہلو میں امید کی کرن جگمگ رہی تھی۔ جھک کر اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔

”آپ کیوں دل چھوٹا کرتی ہیں امان! میں اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ چکی ہوں۔ اور وہ بے نیاز ضرور ہے، بے خبر نہیں۔ میری طاقت سے بڑھ کر مجھے نہیں آزمائے گا۔ بس آپ آنسو پونچھ لیں۔ اس گھر میں خوشی اتری ہے۔ میں ماں بنی ہوں، بیٹے کی ماں اور آپ آنسوؤں کے چراغ جلا رہی ہیں.....!“

امان نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے اور مسکرا کر بولیں۔

”اللہ مبارک کرے تجھے یہ خوشی۔ اور اس کی ہزاروں لاکھوں خوشیاں دیکھو۔“

اس نے امان کو آنسو بہانے سے روک دیا۔ اور خود اس کے آنسو کہیں اندر ہی اندر جمع ہوتے رہے۔ اس رات وہ ایک پل کو نہیں سو سکی تھی کبھی گزشتہ کو سوچتی اور کبھی آنے والے دنوں کو۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آگے پہاڑی زندگی کیسے گزارے گی۔ امان کہہ رہی تھیں، بھول جاؤ سب اور یہ کیسے ممکن تھا بھلا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹنے لگا تھا۔

اگلے روز ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر امان سودا سلف لانے بازار چلی گئی تھیں کہ صاحب آگئے کیونکہ دروازہ کھلا تھا۔ اس لیے وہ سیدھا اندر چلے آئے۔ وہ انہیں دیکھ کر کچھ ہم سی گئی اور نقاہت کے باوجود اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”تمہاری امان کہاں ہیں؟“ انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہیں بازار تک گئی ہیں۔ ابھی آجائیں گی۔“ وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دزدیدہ نظروں

واپس آ کر اس سے پوچھنے لگیں۔

”تم نے کچھ کھایا؟“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر امان محض زاہدہ کو سنانے کی خاطر کہنے لگیں۔

”بتا آئی ہوں تمہارے سر کو۔ پوتے کا سن کر خوش تو ہوئے، لیکن آنے کا کچھ نہیں بولا۔“

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بظاہر اکتا کر بولی۔

”مرضی ان کی..... آئیں نہ آئیں۔“ پھر زاہدہ کے جاتے ہی امان سے پوری تفصیل سننے کو بیتاب ہو گئی۔ جیسے ہی امان باہر کا دروازہ بند کر کے واپس اندر آئیں تو اس نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”کیا ہوا امان؟ راجہ سے ملاقات ہوئی کیا کہا اس نے اور بیگم.....؟“

”بس کر بیٹی! مت نام لے ان کا۔ اگر ان میں ذرا سی بھی انسانیت ہوتی تو پہلے تیرے سر پر ہاتھ رکھتے۔“

اس کی بیتابی سمجھتے ہوئے امان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ رندھی ہوئی آواز میں ٹوک کر کہنے لگیں۔ اب تو بس یہی کہوں گی کہ بھول جاؤ سب، کیونکہ سیف کی شادی ہو چکی ہے۔ بہو بیگم سارے جہان میں اٹھلاتی پھر رہی تھیں۔“

”امان.....“ ہونٹوں کی بے آواز جنبش کے ساتھ وہ سناٹوں میں چلی گئی۔ اور امان روتے ہوئے بتانے لگیں۔

”مجھے دیکھتے ہی سیف بھاگ گیا تو میں بیگم اور صاحب کے کمرے میں چلی گئی۔ انہیں پوتے کا بتایا جس پر بیگم نے سخت ناگواری کا اظہار کیا، سو الزام لگائے۔ ذرا خدا کا خوف نہیں اس عورت کو۔ اور خدا بھی پتہ نہیں کیسے۔ ایسے ہی لوگوں پر مہربان رہتا ہے۔“

اس نے زندگی میں پہلی بار امان کو شاک کی ہوتے دیکھا تو اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔

”سمجھو اس کا باپ مر گیا۔“

اکلوتے بیٹے کے بارے میں کہتے ہوئے ان کا اپنا کلبچہ پھٹ گیا۔ سر جھکائے اتنے بے بس نظر آ رہے تھے کہ وہ کتنی دیر تک انہیں دیکھ گئی۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ کر بیٹھی اور بہت آہستہ سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”میں کچھ نہیں مانگوں گی تایا ابا! بچے کا باپ بھی نہیں، لیکن اسے زندہ رہنا چاہیے۔ مجھ سے پوچھیں اتنے بیمار خف ولاغر ہونے کے باوجود ابا میاں کتنا مضبوط سا بناتے تھے ہمارے لیے۔“

انہوں نے اس کی طرف دیکھنا چاہا لیکن دیکھ نہیں سکے تو اس کے گرد بازو کا حلقہ بنا کر اسے سینے سے لگا لیا۔ وہی مہک تھی جو ابا میاں کے شفقت سینے پر سر رکھ کر وہ اپنے اندر اتارتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو ٹپکنے لگے۔

”روتے نہیں بیٹا!“ اپنے سینے پر نمی محسوس کر کے انہوں نے اس کا سر تھپک کر ٹوکا۔ تب ہی بچے نے رو کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا تو وہ اسے چھوڑ کر بے اختیار اس کی طرف لپکے اور اسے ہاتھوں پر اٹھالیا۔ وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کر دیکھنے لگی۔

”بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔ لیکن اسے اس جیسا نہیں ہونا چاہیے، کیوں بیٹا!“ ماحول خوشگوار بنانے کی غرض سے انہوں نے ہلکے پھلکے انداز میں اس سے کہا، تو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ ذرا سانس لی۔ پھر خیال آنے پر فوراً اٹھتے ہوئے بولی۔

”آپ بیٹھیں تایا ابا! میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”نہیں۔ یہ چائے کا وقت نہیں ہے تم آرام کرو۔“

انہوں نے بچے کو اس کی جگہ پر لٹاتے ہوئے چائے کے لیے منع کیا، پھر اس کے پاس آ کر بولے۔

”تمہاری اماں یہ نہیں کہیں گی۔ خیر میں پھر آؤں گا۔ تم اپنا خیال رکھو اور ہاں یہ

سے انہیں آگے آتے اور پھر اماں کی چار پائی پر بیٹھتے دیکھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ کہنے لگے۔

”تمہاری اماں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ کیا ضرورت تھی اس طرح چوری چھپے تمہاری شادی کرنے کی۔ کم از کم مجھے تو بتایا ہوتا۔“

”اماں بتانا چاہتی تھی، لیکن رجبہ..... میرا مطلب ہے سیف۔ اسے خدشہ تھا کہ آپ لوگ ہرگز یہ شادی نہیں ہونے دیں گے۔“

”وہ نامعقول.....“ اچانک غصے میں آ کر انہوں نے اسی قدر کہا۔ اور فوراً خاموش بھی ہو گئے جیسے خود پر ضبط کر رہے ہوں۔ پھر کتنی دیر بعد گویا ہوئے۔

”بہر حال جو بھی ہوا اچھا برا..... میں ذمہ دار نہیں ہوں۔ پھر بھی میں تمہیں نظر انداز نہیں کر سکتا۔ بتاؤ تم کیا چاہتی ہو۔“

”جی.....؟“ وہ نا سمجھی کے عالم میں دیکھنے لگی تو وہ کچھ رک کر بولے۔

”دیکھو بیٹا! یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں تمہیں اپنے گھر لے جاؤں، کیونکہ سیف کی شادی ہو چکی ہے۔ اور نہ میں تمہیں یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ سیف کے حوالے سے کسی اچھے وقت کا انتظار کرو، بلکہ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اسے اپنی زندگی سے نکال پھینکو..... میں خود تمہاری کسی اچھی جگہ شادی کروں گا۔“

”تایا ابا!“ وہ ایک دم سناٹے میں آ گئی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں بیٹا! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ آگے پہاڑی زندگی اور اماں کب تک تمہارا ساتھ دیں گی۔“

”بس کریں تایا ابا! مجھ میں مزید برداشت کا حوصلہ نہیں ہے۔“

ضبط کرتے کرتے بھی وہ پھٹ پڑی۔ ”آپ کو اگر مجھ پر مہربانی کرنا ہی ہے تو میرے بچے کو اس کا باپ لا دیں اور کچھ نہیں مانگتی میں۔“

تھی۔

سارا سارا دن وہ اور اتناں اسی کے ساتھ لگی رہیں۔ پھر ہر تیسرے چوتھے روز کچھ دیر کے لیے ہی سہی تایا آتا آ جاتے تھے۔ اور جب سے انہوں نے آنا شروع کیا تھا اسے ماہانہ خرچ بھی دینے لگے تھے۔ اس لیے غم روزگار سے نجات مل گئی تھی۔ اور ایک طرح سے اتناں کی بات بھی رہ گئی تھی جو انہوں نے محلے والوں سے کہا تھا کہ اس کامیاں باہر گیا ہوا ہے۔ اب سب ہی سمجھنے لگے تھے کہ وہ باہر سے اسے خرچ بھیج رہا ہے۔

بہر حال بہت ساری فکر و نجات کے باوجود اصل فکر اپنی جگہ موجود تھی۔ اتناں اور تایا اب دونوں کا خیال تھا کہ اسے سیف سے طلاق دلوا کر کسی اور جگہ اس کی شادی کر دی جائے۔ اور وقتاً فوقتاً دونوں اسے سمجھانے کی کوشش کرتے، لیکن وہ اس بات کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی۔ ایک تو اس ستم گر کی محبت دل سے نکال نہیں پائی تھی، دوسرے بچے کا خیال تھا کہ سکے باپ نے نہیں اپنایا تو پھر سو تیل تو پھر سو تیل ہوتا ہے۔ اور اس بات پر اتناں بھی خاموش ہو جاتی تھیں۔

بچہ پاؤں پاؤں چلنے لگا تو اکثر باہر جانے کے لیے مچلنے لگتا تھا۔ اُس روز اس کے مچلنے پر وہ خود ہی اسے لے جانے پر تیار ہو گئی۔ پڑوس میں زاہدہ کی شادی تھی۔ اُس نے سوچا بچے کے اور اپنے لیے ایک سوٹ لے لے گی۔ اس خیال سے مارکیٹ چلی گئی۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے شاپنگ میں لگ گئے۔ واپس آئی تو دروازے پر تایا اب کی گاڑی دیکھ کر کچھ متوحش ہو گئی، کیونکہ وہ اکثر شام میں آتے تھے۔ دوپہر میں ان کی آمد پر اُس کی پریشانی فطری تھی۔ تیز قدموں سے اندر آئی تو اتناں کے پاس بیگم کو بیٹھے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ اور فوراً واپس پلٹنا چاہتی تھی کہ اتناں نے پکار لیا۔

”ادھر آؤ کلثوم!“

”تھک گئی ہوں اتناں! لیٹوں گی۔“ اُس نے وہیں سے کہا اور بچے کو لیے ہوئے دوسرے کمرے میں آ گئی۔

”اتناں پاس۔“ بچہ اُس کی گود سے نکلنے لگا تو اس نے ڈانٹ کر اُسے لٹا دیا اور خود ادھر

رکھ لو۔“ جیب سے لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمایا اور پھر آنے کا کہہ کر چلے گئے تو کچھ دیر تک وہ ان کے پیچھے نظریں جمائے کھڑی رہی۔ پھر اپنی جگہ پر نیم دراز ہوتے ہوئے لفافہ کھول کر دیکھا۔ اتنے بہت سارے سرخ سبز نوٹ پھسلے آئے تھے۔ کچھ اس کی گود میں گرے، کچھ چارپائی کے نیچے اور ابھی وہ سمیٹ رہی تھی کہ اتناں آ گئیں۔

”ہائیں! یہ اتنے سارے پیسے کہاں سے آئے؟“ اتناں اس کے سر پر آن کھڑی ہوئیں۔ تو وہ ایسی ہی پرسوج نظروں سے انہیں دیکھ کر بولی۔

”تایا آئے تھے وہ دے گئے ہیں۔“

”تاک۔ کب آئے تھے؟“ اتناں اپنی کرسی قریب گھسیٹ کر بیٹھ گئیں۔

”آپ کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی آئے تھے۔ کافی دیر بیٹھے رہے تھے پھر آنے کو کہہ گئے ہیں۔“

”کچھ کہہ رہے تھے میرا مطلب ہے پوتے کو دیکھا؟“ اتناں جو معلوم کرنا چاہ رہی تھیں۔ وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ اس لیے ان کی بات کے جواب میں پہلے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کہنے لگی۔

”اتناں! تایا آئے تھے اور آتے ہی رہیں گے۔ لیکن میرے معاملے میں وہ بالکل بے بس ہیں اور اتناں آپ کو تو پہلے سے معلوم تھا کہ اپنے گھر میں ان کا بس نہیں چلتا۔ اس لیے آپ انہیں کوئی الزام نہیں دیتیے گا۔“

”لو.....! میں کیا الزام دوں گی۔ بلکہ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ پوتے کی کشش انہیں کھینچ لائی۔ اسی طرح اللہ چاہے گا تو ایک دن اس کا باپ بھی آجائے گا۔“ اتناں کی آنکھیں چمکے لگیں۔

☆☆☆

یونہی وقت گزرتا چلا گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کی اور اتناں کی بے آب و رنگ زندگی میں کچھ رنگ بھرنے کے لیے اوپر والے نے اس کی گود میں بچہ ڈال دیا تھا۔ اسی کے دم سے رونق

”تم نے اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا بیٹی! اور تمہیں یہ بھی یقین تھا کہ وہ تمہارے ساتھ نا انصافی نہیں ہونے دے گا۔ تو اب سمجھ لو وہی بیگم کو تمہارے در پر لے آیا ہے۔ آگے تمہاری مرضی چاہو تو دھتکار دو چاہو تو.....“

”اتناں!“ وہ ان کے گھٹنوں پر پیشانی رکھ کر رونے لگی۔ ”یہ سارے امتحان میرے ہی حصے میں کیوں آئے ہیں۔“

”امتحان سے کیوں گھبراتی ہو برداشت کی طاقت بھی تو دی ہے اُس نے۔“ اُس نے فوراً سراونچا کر کے دھندلائی آنکھوں سے اتناں کو دیکھا۔ پھر قدرے سہم کر پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا ہے۔ راجہ تو ٹھیک ہے ناں؟“ اتناں نے ذرا سراسر ہلایا۔ پھر اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ”جاؤ۔ منہ ہاتھ دھولو۔“

”نہیں اتناں! پہلے مجھے اصل بات بتائیں۔ آپ کچھ چھپا رہی ہیں۔“ وہ اُن کی بات پر ٹھٹھک کر بولی۔ ”میں کچھ نہیں چھپا رہی۔“

”پھر آپ بتاتی کیوں نہیں؟“

”کیا بتاؤں۔“ اتناں کی آواز بھڑا گئی۔ آنسو بے اختیار چھلکے جنہیں دوپٹے میں جذب کرتے ہوئے بولیں۔ ”کوئی دو مہینے پہلے تمہارے تایا اتنا نے سیف کے ایکسڈنٹ کا بتایا تھا۔ بہت چوٹیں آئی تھیں۔ پھر اللہ نے زندگی تو بخش دی لیکن بچہ پیارا آنکھوں سے محروم ہو گیا۔“

”اتناں.....!“ اُس کے ہاتھ کی گرفت اتناں کی کلائی پر سخت ہو گئی۔ اور بے اختیار انہیں جھنجھوڑ کر بولی۔ ”آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”تمہارے تایا نے منع کیا تھا ان کا خیال تھا ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر تمہارے پاس لے کر آئیں گے۔ دو آپریشن ہوئے لیکن.....“

”اور اُس کی بیوی؟“

”وہ اسی وقت چھوڑ گئی تھی جب معلوم ہوا وہ بینائی کھو چکا ہے۔ حالانکہ ڈاکٹروں نے

ادھر ٹہلنے لگی۔ بیگم کی آمد بالکل سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس لیے بے چینی سے ان کے جانے کا انتظار کرنے لگی تاکہ اتناں سے پوچھ سکے۔ پتہ نہیں کب سے آئی ہوئی تھیں۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد برآمدے میں ان کی آواز سنائی دی۔ تو وہ دروازے کی جھری سے دیکھنے لگی۔ اتناں انہیں چھوڑنے باہر تک جا رہی تھیں۔ پھر جیسے ہی اتناں پلٹ کر برآمدے تک آئیں وہ کمرے سے نکل کر ان کے سامنے آ گئی۔

”کیوں آئی تھیں اور انہیں ہمارے گھر کا پتہ کس نے دیا؟“ اُس کے تپے ہوئے لہجے کو اتناں نے قصداً نظر انداز کر دیا۔

”تمہارے تایا نے دیا ہوگا اور کون دے گا۔“

”کس لیے آئی تھیں؟“ وہ چیخ پڑی۔ ”اور آپ نے انہیں اندر آنے کیوں دیا۔ بھول گئیں آپ! کس طرح انہوں نے ہمیں گھر سے نکالا تھا۔“

”نہیں میں کچھ نہیں بھولی۔“

”پھر.....؟“

”پھر کیا۔ دروازے سے لوٹا دیتی۔ کیوں لوٹاتی ارے جب تم نے تایا کو نہیں لوٹایا تھا تو میں اس کی بیوی پر کیسے دروازہ بند کر دوں۔“

اُس کی جرح پر اتناں کو بھی غصہ آ گیا۔ الٹا اُسے لتاڑنے لگیں۔ ”اور تم نے کون سا تعلق توڑ لیا ان سے تایا کی مہربانی پر خوش ہو اور اُس کی بیوی آئی ہے تو ناگوار گزر رہا ہے۔“

”کیا کہنا چاہتی ہیں آپ؟“

”کچھ نہیں کہنا مجھے۔“ اتناں خفگی سے کہتی ہوئی کمرے میں چلی گئیں تو قدرے توقف سے وہ ان کے پیچھے بھاگی آئی اور ان کے پیروں کے پاس گھٹنے ٹیکتے ہوئے عاجزی سے بولی۔

”اتناں! مجھے پریشان نہیں کریں صاف صاف بتائیں بیگم کیوں آئیں تھیں؟“ اتناں کچھ دیر تک اُسے دیکھتی رہیں۔ پھر اُس کے چہرے پر آئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے بولیں۔

امید دلائی تھی کہ آپریشن کے بعد ٹھیک ہو جائے گا، لیکن اس نے انتظار نہیں کیا۔“

”سب ہماری طرح تو نہیں ہوتے اناں!“ اسے حقیقتاً بے حد دکھ ہوا تھا۔ لیکن اندر جو اتنی ڈھیر ساری تلخی بھری تھی۔ اسے بھی ہونٹوں تک آنے سے نہیں روک سکی۔ اناں نے بے حد خاموش نظروں سے اُسے دیکھا اور ایک بار پھر موضوع بدل گئیں۔

”اچھا جاؤ منہ ہاتھ دھولو۔ میں کھانا نکالتی ہوں۔“

”لیکن آپ نے بیگم کی آمد کا مقصد تو بتایا نہیں؟“

”اب کیا بتانے کو باقی ہے ظاہر ہے اپنی بہو اور پوتے کو لینے آئی تھیں۔“

انماں کے جھنجھلا کر کہنے پر وہ ہنس پڑی۔ پھر اٹھتے ہوئے گہری سانس کھینچ کر بولی۔

”ہا۔ آں۔ اب اندھے راجہ کے لیے محلوں کی رانی تو ملنے سے رہی۔“

”کلتوم!“ انماں نے ایسی ملامت آمیز نظروں سے دیکھا کہ وہ سچ مچ کٹ کر رہ گئی۔

پھر ظاہر ہے فیصلے کا اختیار اسے تھا۔ اور اختیار کے باوجود وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ اس تمام عرصے میں پہلی بار کبھی اُس کی محبتوں کو سوچتی اور کبھی کج ادائیگوں کو اور حقیقت تو یہ ہے کہ کج ادائیگوں کا پلڑا بھاری تھا۔ پھر بھی وہ ہار گئی۔ اس لیے کہ اپنے سارے جذبے اُس کے نام لکھ چکی تھی۔ وہ محبت کرے گی تو اسی سے اور نفرت بھی اسی سے ہوگی۔ اور جب اپنے منفی مثبت جذبوں سمیت اُس تک آئی تو پہلے مرحلے پر ہی اُس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

”راجہ! میں تم سے نفرت کرتی ہوں اتنی شدید نفرت کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”پھر آئی کیوں ہو.....؟“ اُس نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو اُس کا ہاتھ اپنی

بھگی پلکوں سے لگا کر بولی تھی۔

”اس لیے کہ میں تم سے محبت بھی ایسی ہی شدید کرتی ہوں۔“